بچوں کا پسندیدہ رسالہ
ماہنامہ
ساتھی
کراچی
اپریل ۲۰۱۶ء
کوڑا کرکٹ زمیں پہ مت پھینکو
مچھلیاں بھی اداس ہیں دیکھو

نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان

ماہنامہ

ساتھی

کراچی

بیک وقت دو زبانوں میں شائع ہونے والا واحد ماہنامہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

چلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۴

اپریل ۲۰۱۶ء

قیمت ۳۰ روپے

مُدیر

محمد طارق خان

مجلسِ ادارت

عبدالرحمٰن المومن

حسام چندریگر

0324-3232449

شعبہ مارکیٹنگ

سید طلال علی

0333-2381277

اُسامہ شیخ

0336-2246181

شعبہ آرٹ

شہود عاقل

سالانہ خریداری

رجسٹرڈ ڈاک 500 روپے

مشرقِ وسطیٰ 75 ریال

دیگر ممالک 35 ڈالر

ناشر سرفراز احمد

رابطہ کیجیے

ایف 206، سلیم ایونیو، بلاک 13-B

گلشنِ اقبال، کراچی

پوسٹ بکس نمبر: 17982

فون نمبر: 34976468

اوقاتِ کار: شام ۵ تا رات ۱۰ بجے

monthlysathee@hotmail.com
satheecirculation@gmail.com
www.facebook.com/monthlysathee

دل پہ دستک

علی: ''تمھیں معلوم ہے، کسی انسان کا دل دُکھانا خانہ کعبہ کو ڈھانے سے زیادہ بُرا عمل ہے۔''

عمیر: ''ہاں، لیکن تمھارا دل کس نے دُکھا دیا؟''

علی: ''صرف میرا نہیں کروڑوں انسانوں کا دل دُکھا تھا۔ جب اُس نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔''

عمیر: ''لیکن اُس کو تو تمھاری طرح کے عاشقِ رسول نے گولی مار کے ہلاک کر دیا تھا۔''

علی: ''وہ تو ہلاک ہو گیا لیکن ہماری مغرب نواز حکومت تو زندہ ہے۔ جس نے عاشقِ رسول کو پھانسی پر چڑھا دیا۔''

عمیر: ''اب حکومت کو پھانسی دینا چاہتے ہو؟''

علی: ''نہیں، میں حکومت کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر عمل کر کے (اچھا بچہ بن کے) دکھانا چاہتا ہوں۔''

عمیر: ''تمھارا کیا خیال ہے، تمھیں دیکھ کر حکومت بھی اچھی ہو جائے گی؟''

علی: ''ہاں، اور اگر اچھی نہیں بھی ہوئی تو اچھے لوگوں کو ساتھ ملا کر ہم ایک اچھی حکومت بنالیں گے۔''

عمیر: ''خیال تو اچھا ہے لیکن شہید کا کچھ خون بہا بھی تو ہونا چاہیے؟''

علی: ''اس شہید کے خون کی قیمت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ چلو دیکھتے ہیں علامہ اقبال نے کیا بتایا ہے۔''

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

ساتھی چٹخارے

آپ کی تخلیق

السلام علیکم

”گھر میں بہت رش تھا۔ خاندان اور محلے کے تمام ہی بچے غزنوی کے گھر پر جمع تھے اور خوب دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ کوئی صوفے پر اچھل رہا تھا کوئی چھلی میں پانی بھر کر دوسرے بچوں پر پچکاری مار رہا تھا تو کوئی فریج کھول، بند کر رہا تھا اور تو اور ایک بچہ سفید قالین پر کیچڑ والے جوتے پہنے گھوم رہا تھا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ کچھ بچے کمرے میں ابو کے کام کے کاغذات کو جلا کر اپنا دل بہلا رہے تھے۔ غزنوی بچوں کو ان کاموں سے باز رکھتے رکھتے ہلکان ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ دو منٹ کے لیے بیٹھا نہیں کیونکہ اسے یہ فکر لاحق رہی کہ کوئی بچہ اس کے پیارے اور خوبصورت گھر کو خراب نہ کر دے۔

ساتھیو! آج پاکستان بھی بہت سی مشکلات میں گھرا ہوا ہے اور ہم سب یقیناً اپنے پیارے پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہیں کیونکہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم خاموشی سے ان حالات میں اپنے پاکستان کو مشکلات میں گھرا دیکھتے رہیں گے یا کوئی مضبوط منصوبہ بندی کے ساتھ ہر میدان میں آگے بڑھ کر پاکستان کو خوشحال، ترقی یافتہ اور اسلامی ریاست بنانے کے لیے انتھک محنت کریں گے۔

فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے! کیونکہ آغاز ہمیشہ ایک سے ہوتا ہے۔“

ساتھیو! اوپر آپ نے جو اداریہ پڑھا۔ یہ ہمارے پیارے بھائی **شمعون قیصر** نے اگست ۲۰۱۱ء میں ساتھی کے لیے لکھا تھا۔ ۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء کو ان کی شہادت ہوئی۔ ہم نے سوچا کیوں نا ان کا ایک پیغام آپ تک پہنچایا جائے کہ وہ آپ جیسے بچوں سے کیا چاہتے تھے۔ پھر کیا آپ شمعون بھائی کے مشن پر عمل کرنے کا عزم کرتے ہیں۔

والسلام

محمد طارق خان

مدیر ماہنامہ ساتھی

چاچا فالسہ کا مشورہ

محمد اقبال قریشی

دوپہر میں امی ہمیں اپنی بغل میں یوں دبا کر سوتی تھیں
جیسے مرغی اپنے چوزوں کو

عجیب تو وہ تھے لیکن غریب ہرگز نہ تھے۔ صحت کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھے شاید اس لیے تعلیم کی طرف بچپن سے ہی رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ رجحان اتنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا کہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر ابا کی ڈرائی فروٹ کی دُکان سنبھال لی۔ پہلے تو ابا کو یہ بات کچھ اچھی نہ لگی لیکن جب انھوں نے دکان کا خوب اچھی طرح دھیان رکھنا شروع کر دیا تو ابا نے بھی تعلیم جاری رکھنے پر زور نہ دیا۔ ڈرائی فروٹ کی دکان سے ملحق ایک دُکان شروع سے ہی محلے کے حجام کو کرائے پر دے رکھی تھی۔ آمدن خوب تھی اس لیے بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ محلے بھر میں اس قدر مقبول تھے کہ جہاں کہیں کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ان کی دُکان پر پہنچ کر دل کا بوجھ بھی ہلکا کر لیتا اور کوئی نہ کوئی حل لے کر جاتا۔ ہر فن مولا کا محاورہ شاید ان کو دیکھ کر ہی تراشا گیا تھا......

ارے ارے آپ بھی سوچ رہے ہیں ناں کہ یہ کس کا ذکر لے کر بیٹھ گئے؟ بھئی آج یوں ہی اپنے بچپن کی یادوں کو کرید رہے تھے کہ ایک رنگا رنگ

شخصیت، ماضی کی کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر دل کے آنگن میں اُچھل کود کرنے لگی۔ ان کی یادوں کا بھوت مسلسل شکوہ کیے جا رہا تھا کہ "اتنا کچھ لکھتے ہو میاں، کبھی ہم پر بھی کچھ لکھو، کیا ہماری دُکان کی ریوڑیاں اور مونگ پھلیاں اتنی ہی بدمزہ تھیں آخاہ!"

میں نے اسی لمحے سر کو یوں جھٹکا جیسے چاچا کی یادوں کے بھوت سے جان چھڑانا چاہ رہا ہوں لیکن وہ چاچا فالسہ ہی کیا جو اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیں۔ جی ہاں جب ہم نے ہوش سنبھالا اپنے بڑوں کو اُنھیں اسی نام سے پکارتے سنا۔ اصل نام تو خدا جانے کیا تھا لیکن ان کی فلسفیانہ طبیعت کی وجہ سے محلے والے انھیں چاچا فلسفہ کہتے تھے۔ بچوں سے بے حد پیار اور شفقت سے پیش آتے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ بچے اُن کی دکان پر دو باتوں کی وجہ سے مکھیوں کی طرح منڈلاتے، ایک تو ان کی طرف سے ملنے والی مفت ریوڑیاں اور دوم اُن کی مزے مزے کی باتیں۔

چاچا فالسہ ایسی گفتگو کیا کرتے کہ ریوڑیوں اور مونگ پھلیوں کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔ بچوں کے لیے فلسفہ پیش کرنا مشکل کام تھا، ایک بار کسی بچے نے اُنھیں غلطی سے چاچا فلسفہ کے بجائے چاچا فالسہ کہہ دیا، بس پھر کیا تھا، ہر خاص و عام کے لیے وہ چاچا فالسہ ہی ہو گئے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی چاچا فالسہ کے ہر فن مولا ہونے کی۔ ان گنت خوبیوں اور صفات کے مالک و مختار تھے۔ ایسا کون سا جوہر تھا جو اُن کے اندر موجود نہیں تھا۔ سائیکل سے لے کر ٹرک تک ہر گاڑی چلانے کا تجربہ تھا یہ اور بات کہ ہم نے کبھی بھی انھیں سائیکل سیدھی چلاتے نہیں دیکھا، ٹرک کیسا چلاتے ہوں گے اس کا اندازہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔ مہینے میں ایک بار منڈی سے مال لانے کے لیے ہمسائے سے اُدھار لی ہوئی چنگ چی یوں چلاتے کہ ہر موڑ پر وہ ان سے یا اُس سے پناہ مانگتے تھے۔ سمجھدار اس قدر کہ لوگ دور دور سے ان سے مشورے لینے آتے۔

دریا دل اتنے کہ مجال ہے جو اُنھوں نے کبھی کسی سے مشورے کے عوض فیس وصول کی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ اپنے پلے سے چائے کی ایک چینک منگوا لیتے تھے، وہ بھی صرف اس لیے کہ اس کے بغیر ان کا میٹر چالو نہیں رہتا تھا۔ یہ ہم نہیں بلکہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ چائے ہے تو جہان ہے ورنہ دنیا موئی قبرستان ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت تھی کہ چائے پیتے ہی ان کے چودہ طبق روشن ہوتے جب کہ سننے والے کے اتنے طبق روشن ہو جاتے کہ وہ راستے میں کچھ فی سبیل اللہ تقسیم کرتے ہوئے گھر پہنچتا۔ اس میں زیادہ کمال ان کی جناتی زبان کا تھا۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

"کیا خامہ فرسائی ہے کہ اُون کی ایرانی رضائی ہے یا خدا دل کیا کلیجہ بھی چھین لیا ظالم تو نے آخاہ!"

ہر جملے کے آخر میں آخاہ کا تانکا یوں فٹ کرتے کہ بے اختیار دل تھام لینے کو جی چاہتا۔ اس پر ان کا کوہ قاف کے کسی منہ پھٹ جن کی طرح قہقہے لگانا...... یوں تو ان سے ہمارا ٹاکرا کم ہی ہوا لیکن جتنا بھی ہوا یادگار رہا۔

ایسے ہی ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم سکول سے واپسی پر بستہ اور منہ لٹکائے اُن کی دکان کے سامنے سے گزرے تو اُنھوں نے آواز دے کر اپنے روایتی انداز میں بلایا: ''میاں صاحبزادے! کیا نام ہے تمھارا آخاہ۔'' پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے: ''ارے ہاں اقبال میاں، یہ منہ کس خوشی میں لٹکا رکھا ہے، آخاہ۔''

ہمارا منہ اس وقت اس قدر لٹکا ہوا تھا کہ ان سے تو درکنار اپنے آپ سے بھی بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن چاچا کی آواز میں کچھ ایسی مٹھاس تھی کہ بے اختیار قدم رک گئے اور ہم چار و ناچار ان کے پاس جا بیٹھے۔

''بھئی سمجھ گئے ہم کرشمہ قدرت سے اس ناہنجار بیماری کو جو تم لونڈوں کو چپک گئی ہے آج کل آخاہ۔'' وہ جیسے بات کی تہ تک پہنچ کر بولے: ''کام نہیں کیا نا اسکول کا آخاہ!''

ہم نے انھیں یوں گھورا جیسے کچا چبا جائیں گے لیکن ان کی آگے بڑھی ہوئی ہتھیلی پر رکھی ریوڑیاں دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔

''چاچا! وہ امی ابو سرکس میں نہیں جانے دیتے۔'' ہم نے ریوڑیاں چباتے ہوئے جواب دیا۔

''ہائیں! یہ کیا بات ہوئی بھلا، آخاہ۔'' ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی! آپ کو تو پتا ہے پچھلی گلی کے پاس جو مزار ہے وہاں ہر سال کی طرح اس سال بھی میلہ منایا جا رہا ہے اور اس بار جھولے والے بھی آئے ہیں۔ امی ابو جانے نہیں دے رہے، آپ کوئی حل نکالیے نا چاچا فالسہ۔'' ہم نے التجا کی۔

''کیوں نہیں بیٹا! ساری دنیا کو مشورہ دیتے ہیں کیا تم کو نہیں دیں گے آخاہ!'' وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولے۔ ''ہاں آگیا آگیا۔'' وہ یوں اُچھلے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ ہم بھی ہڑبڑا اُٹھے کہ ابھی تو اچھے بھلے تھے یہ اچانک انھیں کیا آگیا، ہماری شکل کو بگڑتا ہوا دیکھ کر وہ خود ہی بول اُٹھے: ''بھئی ایسے کیا دیکھ رہے ہو ہمیں کان الو مانگ چڑیا ٹوٹو پٹک آئیڈیا آخاہ!'' اُن کی جناتی زبان ہمارے پلے نہ پڑی لیکن اتنا ضرور سمجھ آگیا کہ ان کے دماغ میں آئیڈیا آگیا۔

''بھئی دوپہر میں نکل جانا چپکے سے ٹوٹو پٹاخ چم باجے آخاہ!'' وہ ریوڑیوں کی ایک اور مٹھی بھر کر ہماری جانب بڑھاتے ہوئے بولے۔

اگلے ہی لمحے ہمارا چہرہ کھل اٹھا۔ بھلا یہ خیال ہمارے ذہن میں کیوں نہ آیا، ہم خوشی سے اچھلتے کودتے گھر

روانہ ہو گئے، پیچھے سے چاچا فالسہ اپنی اُلٹی سیدھی جناتی زبان میں آوازیں دیتے رہ گئے لیکن اب ہمیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا،مشورہ جو مل گیا تھا۔کل اتوار تھا اور میلے کا آخری روز، جو بھی کرنا تھا کل ہی کرنا تھا۔

دوپہر میں امی ہمیں اپنی بغل میں یوں دبا کر سوتی تھیں جیسے مرغی اپنے چوزوں کو۔اتوار کی دوپہر بھی منظر کچھ ایسا ہی تھا لیکن باقی دنوں اور اس دن میں فرق اتنا تھا کہ امی کا یہ خیال بالکل غلط تھا کہ ہم ان کی طرح سو گئے ہیں، نیند ہمارے شریر دماغ سے کوسوں دور تھی۔ امی کے سونے کے بعد ہم تھوڑی دیر بے حس وحرکت لیٹے فرار کے منصوبے بناتے رہے۔ جوں جوں امّی کی ہم پر گرفت ڈھیلی پڑتی گئی ہم اُن کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے۔صحن میں نکل کر ماں کے پروں سے نکلنے والے چوزے کی مانند بازو پھڑپھڑائے اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔

اب ہماری منزل ہمارے دوست ٹنکو کا گھر تھا' وہ پہلے ہی اپنے دروازے پر کھڑا ہماری آمد کا منتظر تھا۔ہم دونوں بھاگم بھاگ میدان پہنچ گئے، جہاں جھولے لگے ہوئے تھے۔دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں نہ بندہ نہ بندے کی ذات بس ہم دو ننھے منے بچے۔جھولے والے بھی گرمی سے جان بچانے کے لیے اپنی جگہوں میں سو رہے تھے۔

ہم نے موقع غنیمت جانا اور ایک جھولے میں جا چڑھے اور یوں پینگ چڑھانے لگے جیسے جھولے میں آسمان کو چھونے کا ارادہ ہو۔آخر کو وہی ہوا جس کا ہمارے نادان ذہن کو قطعاً اندازہ نہ تھا۔ مزید بلندی پانے کی آرزو میں پینگ جب زمین کے متوازی ہوئی تو اس کے کڑے کنڈیوں سے نکل گئے۔ہم اور ٹنکو سرکس کے بازی گروں کی طرح فضا میں اُڑتے ہوئے کئی گز دور جا گرے۔ٹنکو کی تو ہمیں کچھ خبر نہیں لیکن ہماری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ زمین اوپر اور آسمان نیچے گھومنے لگا۔اس دوران ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا تو رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے، شاید جھولے والے آ گئے تھے اور اب اُنھوں نے ہم سے اپنے جھولے کا نقصان پتا نہیں کیسے پورا کروانا تھا۔

ذہن کے کسی بھولے بسرے خانے میں اس خیال نے بھی سر اُٹھایا کہ وہ لوگ بچوں کو اغوا کر کے ان سے بیگار بھی لیتے ہیں۔ابھی یہی خیالات ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے ہمیں دبوچ لیا اور پھر کیا ہوا؟ ہمیں کچھ ہوش نہ رہا، بس اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد ہمارا دماغ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆

ہوش آنے پر ہم کو پہلے تو خبر ہی نہ ہو پائی کہ ہم ہیں کہاں پر۔ بے ہوش ہونے سے پہلے بیگاروں کے بارے میں سوچ رہے تھے اس لیے اب بھی ذہن میں

وہی سمائے ہوئے تھے۔ پٹ سن کی بوریوں کی بو اور عجیب سی آوازوں کی جانب دھیان گیا تو یقین آ گیا کہ ہم اپنی نادانی کی وجہ سے کسی بہت بڑی مصیبت سے دو چار بلکہ دو پانچ ہو گئے ہیں۔

اچانک ایک مانوس سی بڑبڑاہٹ کانوں میں پڑی تو آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ چاچا فالسہ کو خود پر جھکا ہوا پایا تو حیرت سے اُچھل پڑے۔

''تو پتاخ دم کشیدم تک نہ دیدم...... آخاہ!'' چاچا بچوں کی طرح تالیاں بجا کر بولے: ''شکر ہے میاں تم ہوش میں آ گئے ورنہ ہم تو ایمبولینس بلانے والے تھے آخاہ''

''لیکن میں آپ کی دُکان میں؟'' ہم نے آس پاس نگاہ دوڑاتے ہوئے ایک تکلیف بھری سسکاری لی۔

''بھئی تمھیں گھر سے چوری چھپے نکلنے کا مشورہ دے کر ہم بہت پچھتائے آخاہ۔'' چاچا ہمیں اٹھا کر بٹھاتے ہوئے بولے: ''بس پھر کیا تھا، تمھارے پیچھے پیچھے پہنچ گئے، لیکن تم جھولا اچھا جھلا لیتے ہو، آخاہ۔''

''وہ ننکو بھی تو تھا ساتھ میرے؟'' ہم نے اِدھر اُدھر پریشان انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے گھر پہنچ چکا ہے، موج آئی ہے بس آخاہ۔''

تھوڑی دیر تک اپنی چوٹیں سہلانے کے بعد ہم نے بھی گھر کی راہ لی۔ اس دن کے بعد سے ہم نے توبہ کر لی کہ امی ابو کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نہ نکالیں گے۔

آج ہم جب بچوں کے اغوا اور قتل کی المناک خبریں سنتے رہیں، تو ہماری روح کانپ جاتی ہے۔ ہم ہر بچے کو اپنے فرار کی سزا کا حال سنا کر تاکید کرتے ہیں کہ والدین کی اجازت کے بغیر وہ ہرگز گھر سے باہر قدم نہ رکھیں، اسی میں ان کی بھلائی ہے۔

☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

ڈرائی فروٹ: خشک میوہ (کاجو، پستہ، بادام وغیرہ)

آمدن: معاوضہ، کمائی	ناہنجار: گمراہ، بے راہ رو
لونڈا: کم عمر لڑکا	پینگ: جھولے کی رسّی
خرکار: گدھے والا	بیگار: وہ محنت جس کا معاوضہ نہیں ملے

انکشاف

''مجھ پر چوہے کی آواز کا راز ظاہر ہو گیا ہے۔'' خاتون نے مکینک سے کہا جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے خاتون کے کہنے پر کار کے انجن میں چوہا تلاش کر رہا تھا۔''

''دراصل چوں چوں کی آواز میرے جوتوں میں سے نکل رہی ہے۔'' خاتون نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: احسن اسلم، کراچی

کتابوں کی دنیا

ضیاء اللہ محسن

سوالوں کی دنیا، جوابوں کی دنیا
زمانے میں بکھرے حسابوں کی دنیا
یہ تفریحِ جاں ،یہ نصابوں کی دنیا
بڑی دل نشیں ہے کتابوں کی دنیا

شعور آگہی ،علم ،افکار ان میں
وطن کی محبت کا اقرار ان میں
ترقی کے پوشیدہ آثار ان میں

حقیقت کی دنیا ،یہ خوابوں کی دنیا
بڑی دل نشیں ہے کتابوں کی دنیا

بڑھائے یہ انسان کے حوصلے کو
جگائے یہ جذبے کو اور ولولے کو
معطر کرے روح کے سلسلے کو

یہ رنگوں ، بہاروں ،گلابوں کی دنیا
بڑی دل نشیں ہے کتابوں کی دنیا

کتابوں کی خوشبو جو آتی رہے گی
مری روح میں یہ سماتی رہے گی
خرد اپنی معراج پاتی رہے گی

حقیقت میں بدلے سرابوں کی دنیا
بڑی دل نشیں ہے کتابوں کی دنیا

کوئی چیز ہم سے چھپاتی نہیں ہے
کتابوں سے اُلفت تو جاتی نہیں ہے
مگر میرے دل کو جو بھاتی نہیں ہے

شرابوں ، کبابوں ،نوابوں کی دنیا
فقط دل نشیں ہے کتابوں کی دنیا

مشکل الفاظ کے معانی

اَفکار: فکر کی جمع (خیالات)

خِرد: عقل، دانائی

سَراب: وہ ریت یا تارکول جس پر دھوپ پڑے تو دور سے پانی دکھائی دے

تصویر بناتے ہوئے مصور نے جان بوجھ کر جو (۱۱) غلطیاں کی ہیں

کیا آپ ان کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟

مضمون لکھنا کہانی کے مقابلے میں قدرے آسان ہے کیونکہ اس کی مشق ہم اسکول کی ابتدائی جماعتوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن جس قدر یہ آسان ہے اسی قدر مشکل بھی ہے کیونکہ مضمون لکھنا کمال نہیں ہے بلکہ اسے قارئین کے لیے آسان اور دلچسپ بنانا دراصل کمال ہے اور اسی کمال کے لیے ہمیں جمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی کمال و جمال پر روشنی ڈالنے کے لیے مضمون پر مضمون لکھ رہا ہوں۔

کہانی اور مضمون میں فرق

اس سے قبل کہ مضمون پر روشنی ڈالیں ہمیں مضمون اور کہانی کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ کہانی اور مضمون میں وہی فرق ہے جو بریانی اور دال چاول میں ہے۔ بھوک دونوں سے مٹائی جاسکتی ہے لیکن ایک سے صرف پیٹ بھرا جاتا ہے اور دوسرے سے ہم ذائقہ کی تسکین بھی کرتے ہیں۔ یہی فرق چائے اور پانی میں بھی ہے۔ پانی سے پیاس مٹائی جاتی ہے اور چائے سے ہم ذائقے کی تسکین کرتے ہیں۔ یہاں چائے اور بریانی کو ہم کہانی کا نام دیتے ہیں اور دال چاول اور پانی کو مضمون سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی تحریر میں احساسات و جذبات کے مسالے ایک خاص ترکیب سے ڈالے جائیں تو کہانی بن جاتی ہے اور اگر تحریر میں سادگی سے اپنی

بات کو واضح یا پیش کیا جائے تو وہ مضمون بن جاتا ہے۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ کہانی نہ سناؤ سیدھے طریقے سے بات کہو۔

چند باتیں جو 'کہانی کیسے لکھیں' میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں بھی مختصراً بیان کروں گا جو ایک اچھے مضمون کے لیے بھی ضروری ہیں۔

مرکزی خیال

کہانی کا سب سے اہم عنصر مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ اسی طرح مضمون میں بھی ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے جس کے گرد مضمون کو چلایا جاتا ہے۔ جو عموماً اس کا موضوع ہوتا ہے۔ اس سے مضمون کو ایک دائرے میں رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ''جھوٹ بولنا بُری بات ہے'' مرکزی خیال ہے۔ میں اس پر کہانی لکھنے کے لیے چند کردار تخلیق کروں گا یا پھر اپنی خودنوشت بیان کروں گا۔ لیکن مضمون میں مجھے اپنی بات واضح کرنے کے لیے ایسے دلائل اور مثالوں کی ضرورت ہوگی جن سے میں اپنے پڑھنے والوں کو قائل کرسکوں۔

مشاہدہ و معلومات

کہانی میں مشاہدہ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن مضمون میں معلومات کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ معلومات آپ نے کہاں سے حاصل کی ہیں اس کا ماخذ (Source) بہت اہم ہوتا ہے۔ مضمون میں اس کا حوالہ ضرور دینا چاہیے تاکہ بات کے سچ ہونے کی تصدیق ہوسکے۔ ضروری نہیں کہ آپ ظہیرالدین

بابر سے ملے ہیں تو ہی اس کے بارے میں مضمون لکھ سکتے ہیں۔لیکن یہ ضروری ہے کہ معلومات کے لیے اس کے بارے میں دو تین مستند کتب ضرور پڑھیں۔

کردار

کہانی کے کردار جھوٹے ہو سکتے ہیں لیکن مضمون میں جھوٹے کرداروں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔کہانی عموماً جھوٹی ہوتی ہے لیکن مضمون ہمیشہ سچ پر مبنی تحریر کیا جاتا ہے۔کہانی میں شیر اور بکری سے بھی بات چیت ہو جاتی ہے لیکن مضمون میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

درجہ بندی

کہانی کی اقسام نہیں ہوتیں صرف طرزِ تحریر ہوتا ہے جنھیں ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک خودنوشت یعنی آپ بیتی اور دوسری جگ بیتی۔اس کے برعکس مضمون کی کئی اقسام ہیں۔مثال کے طور پر:

☆ تاریخی مضامین ☆ معلوماتی مضامین

☆ سائنسی مضامین ☆ مزاحیہ مضامین

☆ مذہبی مضامین ☆ ادبی مضامین

☆ معاشرتی مضامین ☆ کھیلوں پر مضامین

وغیرہ وغیرہ......

ہم جب کوئی مضمون لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر سب سے پہلے مضمون کی درجہ بندی (Category) کا انتخاب ہوتا ہے۔

عنوان

مضمون کا عنوان اکثر فیصلہ کردیتا ہے کہ اسے کون پڑھے گا۔مثال کے طور پر مضمون کا عنوان ہے ''ظہیر الدین بابر'' تو یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ شخصیت پر مضمون ہے اور تاریخی بھی ہے۔اسے وہی پڑھنا پسند کرے گا جسے اس طرح کے مضامین پسند ہیں یا جو تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے۔لیکن اس طرح ہمارے مضمون کا مقصد اور دائرہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔ عنوان ایسا ہونا چاہیے جو ہر کسی کے لیے دعوت عام ہو، نہ کہ دعوت خاص۔اس لیے ضروری ہے کہ عنوان ایسا دلچسپ اور مبہم رکھیں کہ ہر کوئی اسے پڑھنے کی طرف مائل ہو۔

اندازِ تحریر

اس سے پہلے کہ مضمون کا آغاز کریں میں یہ بات واضح کردوں کہ مضمون کا اندازِ تحریر ہی دراصل مضمون کو مضمون بناتا ہے۔جس طرح کہانیوں میں ہر جملہ دوسرے جملہ سے جڑا ہوتا ہے، اسی طرح مضمون میں بھی ہر جملے کو دوسرے جملے سے جڑا ہونا چاہیے کہ جیسے موتیوں کی مالا ایک دھاگے میں پروئی جاتی ہے۔اب چاہے موتی مختلف رنگوں کے ہوں، کسی بھی پتھر سے

بنے ہوں لیکن انھیں ایک لڑی میں ہونا چاہیے۔ تا کہ پڑھنے والا ایک رو میں پڑھتا چلا جائے اور پھر جیسے جیسے مضمون آگے بڑھے اس کی دلچسپی کو برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے دلچسپ اشعار اور امثال کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس میں طنز و مزاح بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور دلچسپ محاوروں اور ضرب الامثال کا بھی سہارا لیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ کب کہاں کیا استعمال کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ اپنے پانچ دلچسپ مضامین کا انتخاب کریں اور ان کا دیے گئے نکات کی روشنی میں جائزہ لیں۔

نکات یا پیراگراف

مضمون کو آسان طریقے سے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مضمون کو نکات (Points) میں تحریر کیا جائے۔ یعنی مضمون کے اندر درجہ بندی کرلی جائے تا کہ مضمون کے ہر پہلو یا ہر نکتہ پر وضاحت سے بات ہو سکے۔
دوسرا طریقہ بغیر نکات کے پیراگراف کی شکل میں تحریر کرنا ہے۔ اس میں جو بات نکات کی شکل میں پیش کی جاتی تھی وہ اب ایک پیرگراف کی شکل میں ہوگی لیکن پڑھنے والے کو پتا نہیں چلے گا کہ وہ اب کس نکتے پر پڑھنے لگا ہے، اس طریقے سے دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ لیکن نئے لکھنے والے اپنا مضمون نکات کی شکل میں پیش کریں۔

نقطہ آغاز

کہانی کی طرح مضمون کا بھی نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم ابتدائی الفاظ لکھتے ہیں تو اپنی بات کی وضاحت گویا کردیتے ہیں جو شاید عنوان سے آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ آپ کی ساری توجہ ابتدائی الفاظ پر ہونی چاہیے کیونکہ یہی الفاظ کامیابی کی چابی یعنی (Key words) ہوتے ہیں۔ اسے اپنی بات کی وضاحت سے شروع نہ کریں بلکہ دلچسپی کو پیش نظر رکھیں۔

نقطہ اختتام

مضمون جب اختتام پر پہنچتا ہے تو یہاں ایک ایسی بات یا پیغام ہونا چاہیے جو پورے مضمون کا احاطہ کردے۔ ایسا لگنا چاہیے کہ بات کا اختتام ہوگیا ہے نہ کہ ایسا لگے کہ ابھی تشنگی رہ گئی ہے۔ خوبصورت جملوں سے مضمون کا اختتام مضمون کو بہترین مضامین کی صف میں لے آتا ہے۔ کہانی کا اختتام اکثر پڑھنے والے کی سوچ پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس سے پیغام اخذ کرے لیکن مضمون میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ یہاں بات کی وضاحت کی جاتی ہے کہ قاری مضمون پڑھ کر ہی پیغام اخذ کرلے۔

ساتھی مصوّری

فائزہ کامل

ارم بلوچ محمد رفیق

مہرالنساء، عبداللہ

ابن عدنان

محمد عمر بن عبدالرشید

سکینہ عبدالحنان

رافعہ فاروق شیخ

حرمت والی مسجد

مسجد حرام جزیرہ نما عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں واقع ہے جو سطح سمندر سے ۳۳۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے، مسجد حرام کی تعمیری تاریخ عہد حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام سے تعلق رکھتی ہے۔ مسجد حرام کے درمیان میں بیت اللہ واقع ہے جس کی طرف رخ کر کے دنیا بھر کے مسلمان دن میں ۵ مرتبہ نماز ادا کرتے ہیں۔ بیرونی واندرونی مقام عبادات کو ملا کر مسجد حرام کا کل رقبہ ۴۰۰ لاکھ ۸ ہزار ۲۰ مربع میٹر ہے اور حج کے دوران اس میں ۴۰ لاکھ ۲۰ ہزار افراد سما سکتے ہیں۔

یہ دنیا کا واحد مقام ہے جس کا حج کیا جاتا ہے۔ یہ زمین پر قائم ہونے والی پہلی مسجد ہے۔

کعبہ جو کہ مشرق و مغرب میں سب مسلمانوں کا قبلہ ہے مسجد حرام کے تقریباً وسط میں قائم ہے جس کی بلندی تقریباً ۱۵ میٹر ہے اور وہ ایک چوکور حجرہ کی شکل میں بنایا گیا ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنایا۔

قریش کعبہ کی تعمیر وادی کے پتھروں سے کرنے کے لیے اُن پتھروں کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لاتے اور بیت اللہ کی بلندی ۲۰ ہاتھ رکھی، کعبہ کی تعمیر اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کے نزول کا درمیانی وقفہ ۵ برس اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکہ سے نکل کر مدینہ جانے اور کعبہ کی تعمیر کی درمیانی مدت ۱۵ برس تھی۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسجد آج کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی۔ عثمانی دور میں مسجد تقریباً موجودہ صحن کے رقبے تک پھیل گئی۔ سب سے عظیم توسیع سعودی دور حکومت میں ہوئی جس میں مسجد کو دور جدید کے معیارات کے مطابق بنایا گیا اور ایئر کنڈیشنر اور برقی سیڑھیاں بھی نصب کی گئیں۔ اس وقت مسجد کی تین سے زیادہ منزلیں ہیں جن میں ہزاروں نمازی عبادت کر سکتے ہیں۔

آج کل مسجد کے کُل ۱۱۲ چھوٹے بڑے دروازے ہیں جن میں سب سے پہلا اور مرکزی دروازہ سعودی عرب کے پہلے فرمانروا شاہ عبدالعزیز کے نام پر موسوم ہے۔ مسجد حرام سے ملحق صفا اور مروہ کی پہاڑیاں بھی ہیں۔ مسجد حرام کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے امن کا گہوارہ بنایا ہے اور اس میں ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہے۔
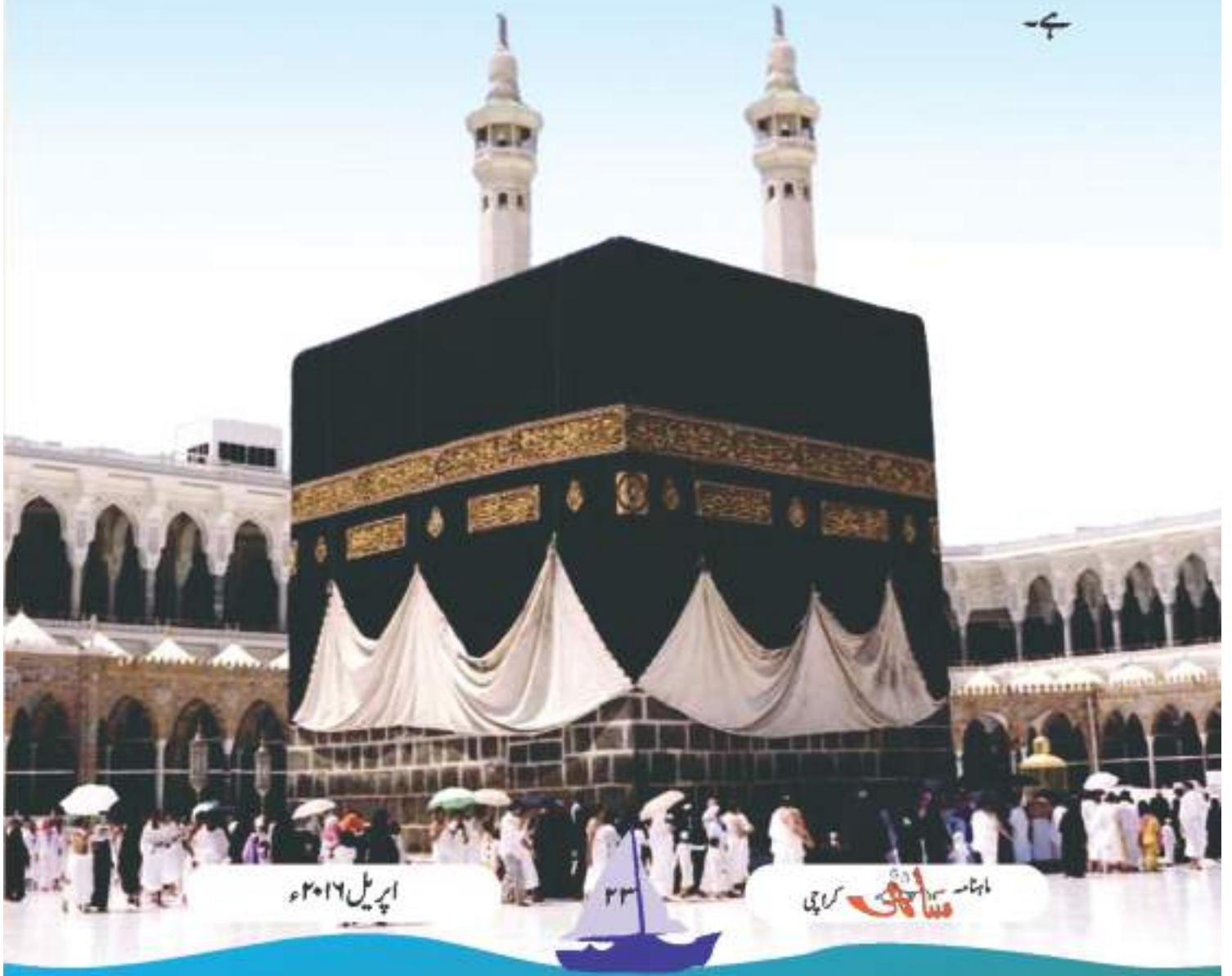
کھچڑی

بیناصدیقی

''اُفوہ کیسی لڑکی ہو تم؟ ایک رائتہ بنانے میں جان نکل رہی ہے تمھاری؟ لڑکیوں کے لیے خاص تحریر

''یہ کوفتے لوناں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔'' ماہم اخبار میز پر بچھائے وقفے میں سب کو بڑے اصرار سے کوفتے کھلا رہی تھی۔

''واہ اتنے مزے کے کوفتے...... ہاتھوں سے بنتے ہیں کیا؟'' فائزہ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''اوہو میرا مطلب ہے۔ میں نے خود بنائے ہیں بڑی محنت سے۔'' ماہم جھینپ کر بولی۔

''اوہو اتنے مزے دار کھانے تم کیسے بنالیتی ہو؟ ابھی تو تم صرف نہم جماعت میں ہو۔ میرے گھر میں تو سب کچھ امی یا باجی پکاتی ہیں۔'' سدرہ نے تعریفی لہجے میں کہا اور اگلا کوفتہ کھانے کا لائسنس حاصل کرلیا۔

''بس مجھے شوق ہی بہت ہے پکانے کا۔ پھر میرے ہاتھ میں قدرتی طور پر ذائقہ بھی ہے۔'' ماہم اترا کر بولی۔

''یہ قدرتی ذائقہ تمھاری امی کے ہاتھوں کا تو نہیں ہے؟'' فرح مشکوک لہجے میں بولی۔

''اتنے بہترین کھانے تو بھئی مائیں ہی پکا سکتی ہیں۔''
فرح نے مزید کہا تو ماہم چڑ گئی: ''مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی؟ اور اپنی امی کے ہاتھ کے کھانے کو اپنا کھانا کہنے کی؟ حد ہوگئی فرح۔'' ماہم برا مان کر بولی اور کوفتے کا ٹفن فرح کے آگے سے اُٹھالیا۔
''ارے ارے تم تو ناراض ہی ہوگئیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' فرح اتنے مزے دار کوفتے ہاتھ سے جاتے دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

☆......☆

''امی...... میری سب سہیلیاں کوفتے کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔'' ماہم نے خالی برتن باورچی خانے میں رکھتے ہوئے کہا۔
''لو یہ کیا؟ بس؟ امی کی دن بھر کی محنت کا یہی صلہ ہے؟ دو تعریفی جملے اور ایک عدد خالی برتن؟'' ماہم کا بھائی معاذ مذاق اُڑاتے ہوئے بولا جو پانی کا گلاس اٹھانے کچن میں آ گیا تھا۔
''معاذ! بدتمیزی نہ کرو بیٹا۔ یہ بے چاری بھی مجبور ہے۔ اس کے اسکول والے آئے دن فنکشن کراتے ہیں کسی نہ کسی نام پر اور بچیوں سے کہتے ہیں کہ پیسے جمع کراؤ یا کچھ گھر سے پکا کر لاؤ۔ اب گھر پر پکانا سستا پڑتا ہے۔ تھوڑی محنت ہی زیادہ لگتی ہے ناں۔ وہ میں کر لیتی ہوں۔'' ماہم کی امی اپنے بچوں کے مقابلے میں بہت معصوم تھیں۔ جلدی سے ماہم کی حمایت کرتے ہوئے معاذ کو سمجھانے لگیں۔

''ارے امی! اسکول میں کوئی فنکشن ونکشن نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ کھانے اسکول والے منگاتے ہیں۔ یہ صرف اپنے طور پر لے جاتی ہے اپنی چٹوری سہیلیوں پر رعب جمانے کے لیے کہ اس کو سب کچھ پکانا آتا ہے۔ رعب جمانے کے لیے اور کچھ ہوتا بھی جو نہیں۔'' معاذ سر جھٹک کر بولا۔
''معاذ کے بچے۔ ابھی مزہ چکھاتی ہوں۔'' ماہم غصے میں اس کے پیچھے لپکی۔
''واہ دوستوں کو کوفتے چکھائے اور گھر والوں کو مزہ چکھاؤ گی؟ یہ کیا بات ہوئی؟'' معاذ بھاگتے بھاگتے بولا۔
''بھئی ہم تو رعب جماتے ہیں دوستوں پر اپنی کارکردگی سے۔ اپنے نمبروں سے۔ امی کے بنائے ہوئے کھانوں کو اپنا پکایا ہوا کہہ کر نہیں۔'' وہ دروازے پر رُک کر بولا۔ ماہم اسے پکڑنے لپکی ہی تھی کہ معاذ اسی لمحے دروازہ کھول کر باہر بھاگ چکا تھا۔
''امی دیکھیں اسے۔ کتنا بدتمیز ہے؟'' ماہم پیر پٹخ کر بولی۔
''چھوڑو بیٹا۔ چھوٹا بھائی ہے۔ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔ تم جا کر کپڑے بدلو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ اس شریر کو بھی فون کرو۔ آ کر کھانا کھائے۔'' امی چولھے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

☆......☆

''ماہم بیٹا تمھاری خالہ کا فون آیا ہے۔ میں ذرا فون

سن لوں۔ جب تک تم بریانی دیکھ لو۔ چاول لگ نہ جائیں۔'' امی نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے ماہم سے کہا۔ جو مزے سے بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ ''مجھے تو بریانی کے لگے ہوئے چاول ہی پسند ہیں امی۔ فکر نہ کریں پتیلی کے پیندے میں جتنے چاول چپک جائیں گے وہ میں کھرچ کھرچ کے کھا جاؤں گی۔'' ماہم اطمینان سے بولی۔ ''یقین کریں کہ میں بریانی کے چاول سنک میں نہیں جانے دوں گی۔'' ماہم ٹانگیں ہلاتے ہوئے بولی۔

''حد ہوگئی۔ اچھا چلو۔ فرج میں دہی رکھی ہے۔ تھوڑا سا ہرا دھنیا، پودینہ اور دو ہری مرچ توڑ کے ہرا رائتہ تو بنا دو۔ تمھیں پتا ہے تمھارے ابو اور بھائی رائتے کے بغیر بریانی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔'' امی نے ماہم سے گویا التجائیہ لہجے میں کہا۔

''اُفوہ امی! اتنا لمبا طریقہ کار ہے رائتہ بنانے کا۔ فرج میں رکھی ساری ہری چیزیں نکالو، دھوؤ، توڑو، پیسو اس میں نمک ملاؤ، دہی پھینٹو، پھر اس کے چھینٹے میری کپڑوں پر آئیں۔ میں تو نہیں بناتی رائتہ۔ بغیر رائتے کے اگر ابو اور بھائی نہیں کھائیں گے تو ان کے حصے کی بھی میں کھا جاؤں گی۔ فکر نہ کریں۔'' ماہم سر جھٹک کر بولی۔

''اُفوہ کیسی لڑکی ہو تم؟ ایک رائتہ بنانے میں جان نکل رہی ہے تمھاری؟ اچھا چلو کھیرے کاٹو، ہرے دھنیے کے پتے توڑو میں فون سن کر آتی ہوں۔'' امی سر پر ہاتھ مار کر بے چارگی سے بولیں۔ ''بھئی سیدھی سی بات ہے جس کو ہرا رائتہ کھانا ہے، ہری چیزیں توڑنے مروڑنے کا کام بھی وہی کرے۔ میں تو ویسے بھی اپنا پریکٹیکل جرنل بنانے جا رہی ہوں۔'' ماہم ڈھٹائی سے بولی۔

''امی جتنی دیر آپ نے اس سے کہا اُس میں میں نے دہی پھینٹ دی ہے۔ ہرا دھنیا پودینہ کھیرا سب کاٹ کر اور دھو کر رکھ دیا ہے۔'' معاذ کچن سے نمودار ہو کر بولا۔ ''شاباش میرے بچے! تم لڑکے ہو کر میری مدد کر رہے ہو اور ایک یہ لڑکی ہے۔'' امی افسوس سے بولیں اور فون کی طرف بڑھ گئیں۔

☆......☆

آج چھٹی کا دن تھا۔ ماہم امی سے حلوہ بنانا سیکھ رہی تھی۔ ''بیٹا جب حلوہ پتیلی چھوڑ دے تو سمجھو بھن گیا۔'' امی نرمی سے بولیں۔

''لو بھئی اگر حلوہ پتیلی چھوڑ دے گا تو میں حلوے کے پیچھے بھاگوں گی یہ پوچھنے کے کہ وہ بھن گیا کہ نہیں؟'' ماہم کاہلی سے بولی۔ ''زیادہ ننھی بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر حلوہ بنانا سیکھنا ہے تو سنجیدگی سے سیکھو۔'' نرم مزاج امی کو بھی ماہم کی کاہلی اور ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔ ''سنجیدگی سے آپ نے سیکھ لیا ناں، نانی جان سے۔ اب مجھے کیا ضرورت ہے سیکھنے کی۔'' ماہم مزے سے بولی۔

''پکانا سیکھ لوگی تو تمھارے ہی کام آئے گا۔ یہ بھی ایک

ہنر ہے۔'' امی پھر نرم لہجے میں سمجھانے لگیں۔
''چولھے کے آگے کھڑے کھڑے خود براؤن ہو جاؤ۔ یہ پیاز براؤن نہیں ہوتی سالن کے لیے اور میٹھا بناؤ تو اسے سو گھنٹے چلانا پڑتا ہے۔ جب تک ہاتھ ٹوٹ کر پتیلی میں نہ گر جائے، میٹھے میں ذائقہ نہیں آتا اور رہ گئی روٹی تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایک گول دنیا میں رہتے ہیں تو روٹی بھی گول ہی پکائیں، روٹی لمبی، موٹی، چوڑی، ترچھی اور کچی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ماہم نے امی کے تمام پکانے کے اسباق پر اپنا تبصرہ کیا تو امی نے سر پیٹ لیا۔

☆......☆

خالہ جان کی بیماری کا سنتے ہی امی عجلت میں سامان سمیٹ کر اسلام آباد روانہ ہو گئی تھیں۔ کھانا بازار سے لا کر کھایا جا رہا تھا۔ ایسے میں ماہم کے موبائل پر فرح کی کال آ گئی۔
'' بھئی طے ہوا ہے کہ پرسوں ہم جو ون ڈش ہم کر رہے ہیں اس میں تم وہ حلیم بنا کر لاؤ گی جو تم نے اُردو کے امتحان والے دن کھلایا تھا ہم کو۔'' فرح نے چھوٹتے ہی کہا۔
''اوہ...... حلیم؟'' ماہم کا دم نکل گیا۔ مگر آج کل تو امی اسلام آباد گئی ہوئی ہیں خالہ کے گھر۔'' ماہم کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا۔
''ارے تو کیا وہ حلیم تمھاری امی نے بنایا تھا؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے بنایا ہے؟'' فرح طنزیہ لہجے میں بولی۔
''ارے نہیں بنایا تو میں نے ہی تھا۔ مگر امی آج کل گھر پر نہیں ہیں تو سب گھر کے لیے تینوں وقت کا کھانا میں ہی پکا رہی ہوں۔ اس لیے میرے لیے حلیم پکانا بہت مشکل ہوگا۔ مجھے تو نان اور کولڈ ڈرنکس دے دو۔ وہ لے آؤں گی۔'' ماہم سنبھل کر بولی۔
''افوہ سب سے آسان چیز لے لی تم نے۔ خیر...... ٹھیک ہے۔'' فرح نے منھ بنا کر فون رکھا تو ماہم بھی فون رکھ کے پلٹی۔ ''ہوں تو امی کے جانے کے بعد تینوں ٹائم کا کھانا تم پکا رہی ہو؟ یہ ڈبل روٹیاں تم تیار کرتی ہو؟ یہ نہاریاں اور بریانیاں جو ٹھیلوں سے لائی جا رہی ہیں وہ تم پکا کے ٹھیلوں پر بھجواتی ہو؟'' معاذ معصوم شکل بنا کر بولا: ''معاذ کے بچے۔ میں ابو سے تمھاری شکایت......'' ماہم اس کے پیچھے بھاگی ہی تھی کہ ابو خود ہی کمرے سے نکل آئے۔
''ماہم بیٹا۔ یہ بازار کے کھانے کھا کے پیٹ میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اب یہ باہر کے کھانے گھر سے باہر ہی رہیں تو اچھا ہے۔ مجھے رات کے کھانے میں مونگ کی کھچڑی پکا کے دے دینا۔'' ابو پیار سے بولے۔
''مونگ کی کھچڑی؟ وہ تو مجھے نہیں پکانی آتی۔'' ماہم پر بجلیاں گر پڑیں۔
''چلو میں بتا دوں گا بہت آسان ہوتی ہے۔ میں شارجہ میں تھا تو روز رات کو کھچڑی پکاتا تھا اور ہری چٹنی ڈال کے مزے سے کھاتا تھا۔'' ابو مسکرائے۔

"مگر کھچڑی میں پیاز پڑتی ہوگی۔ مجھے آنسو آتے ہیں پیاز کاٹتے وقت۔" ماہم نے جان چھڑائی۔

"اور ابو چولھا تو نہیں جلانا پڑے گا کھچڑی بنانے کے لیے؟ یہ محترمہ دس بارہ تیلیاں دور سے جلا جلا کر پھینک دیتی ہیں۔ اسے تو چولھا جلانا بھی نہیں آتا ابو۔" معاذ ہنس کر بولا۔ "حد ہوگئی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی نالائق ہو۔" ابو غصے سے بولے۔

"آپ کو جتنا پتا چلا ہے یہ اس سے زیادہ نالائق ہے ابو۔ پڑھنے لکھنے میں صفر ہے اور سہیلیوں پر رعب جمانے کے لیے امی سے قسم قسم کے کھانے پکوا کے لے جاتی ہے۔" معاذ نے شارجہ سے آئے باپ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ماہم اسے گھور کر رہ گئی۔

☆......☆

پہلے گھی، پھر سیاہ الائچی اور پیاز...... ابو ماہم کو سمجھا رہے تھے۔ "افوہ ابو یہ نہیں ہوسکتا کہ سب کچھ اکٹھے ہی ڈال دیں۔ آخر کھچڑی ہی تو ہے۔" ماہم کاہلی سے بولی۔

"ماہم۔" ابو اتنی سخت آواز میں بولے کہ ماہم سہم گئی اور چولھا جلا کر پتیلی میں گھی ڈالنے لگی۔

☆......☆

ماہم میز پر گرم کھچڑی اور ہرا رائتہ رکھ کر پلٹی تھی ہی کہ گھنٹی بجی۔ معاذ نے دروازہ کھولا تو امی کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"ارے امی آگئیں۔ آپ کو تو پرسوں آنا تھا۔ جلدی آگئیں؟" معاذ ماں سے لپٹ گیا۔

"ہاں بھئی تمھاری خالہ اسپتال سے گھر آگئیں تو میں بھی واپس آگئی۔ سوچا کہ کھانے پینے میں تکلیف ہو رہی ہوگی تم لوگوں کو۔" امی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے ناک اونچی کر کے سونگھا۔

"ہم...... کھچڑی بگھاری گئی ہے اور ساتھ ہرے مسالے والا رائتہ بھی ہے۔ کھرے ڈال کر یقیناً تمھارے ابو نے بنایا ہوگا۔ باہر رہ کر وہ بھی بہت کچھ سیکھ گئے ہیں۔" امی مسکرائیں۔

"نہیں جناب ہماری بیٹی نے بنایا ہے۔" ابو فخر سے ماہم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے تو امی حیران رہ گئیں۔

"ماہم نے؟"

"اللہ خیر کرے۔" امی ہنس کر بولیں۔ مگر جب کھانے بیٹھے تو امی نے کہا۔ "کھچڑی بہت نرم اور مزے دار ہے۔ نمک بھی صحیح ہے بالکل۔ شاباش ماہم بیٹا۔" امی پیار سے ماہم کو دیکھ کر بولیں۔

"میری بیٹی ہے ہی اتنی لائق۔" ابو مسکرائے۔ آج ماہم کو زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ اپنے کیے ہوئے کام پر سچی تعریف کا اصل مزہ کیا ہوتا ہے؟ آج کھچڑی بھی بریانی سے زیادہ مزے دار لگ رہی تھی۔ ☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

چٹورا: چٹپٹی وذائقہ دار چیزیں کھانے کا شوقین

پیندا: کسی برتن کا نچلا حصہ

بگھار: وہ تیل یا گھی جس میں پیاز وغیرہ تل کر سالن میں ڈالا جاتا ہے

پاکستانی بچے

شریف شیوہ

ہم ہیں پاکستانی بچے — دنیا میں لاثانی بچے

ہم پنجابی ہیں نہ بلوچی — اپنے دیس کے ہم ہیں موتی

امن کا چاہتے ہیں گہوارہ — مستقبل دو ہم کو پیارا

روشن ''آج'' اور بہتر ''کل'' ہو — پیار سے ہر اک دل جل تھل ہو

ہم میں ہیں کتنے ہی بچے — اچھے کہاں احوال ہیں جن کے

اِن پہ توجہ کرو خدارا — پیار کرو اور بنو سہارا

جب بھی کھانا دودھ ملائی — دھیان میں اِن کو رکھنا بھائی

ٹاٹ پہ بیٹھے جو پڑھتے ہیں — علم جو حاصل یوں کرتے ہیں

انھیں میں کچھ اقبال بنیں گے
قائد حسبِ حال بنیں گے
یہ سب پاکستانی بچے
بنیں گے سب لاثانی بچے

مشکل الفاظ کے معانی — لاثانی: جس کی کوئی مثال نہ ہو — جل تھل: وہ زمین جس پر بہت سا پانی ہو — حسبِ حال: حال کے مطابق

قارئین ساتھی کے حسِ مزاح کو جانچنے کے لیے ماہنامہ ساتھی نے شروع کیا ہے۔ان کے لیے ایک انعامی سلسلہ۔جس میں ہر ماہ بہترین اور دلچسپی سے بھرپور لطیفے بھیجنے والے قارئین ساتھی کو **ڈیئر پنسل** اور بال پین بنانے والے ادارے **انڈس پنسل انڈسٹریز** کی جانب سے دیا جائے گا خوبصورت تحفہ......تو پھر قلم سنبھالیے اور مزاح کے اس دوڑ میں شامل ہو جائیں...... جہاں "ذرا کھلکھلائیے" آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نوٹ: لطیفہ روانہ کرتے ہوئے اس پر اپنا نام، مکمل پتا اور فون نمبر لکھنا مت بھولیے گا۔

DEER PENCIL

سوراخ

ایک دوست دوسرے دوست سے: "رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا کہ کسی نے مجھ پر گولی چلادی۔ میں نے نیند سے اُٹھ کر آئینہ دیکھا تو میرے منہ پر ایک سوراخ تھا۔

دوسرا دوست (حیران ہوکر): "پھر کیا ہوا؟"

پہلا دوست: "پھر کیا میں نے منہ بند کرلیا اور سوراخ بھی بند ہوگیا۔"

مرسلہ: ماریہ سلیم، کراچی

☆......☆

کب آئیں گے

ایک سائیکل سوار کسی محلے میں سے گزر رہا تھا کہ

اچانک ایک بچہ سائیکل کی زد میں آگیا اور زور زور سے رونے لگا۔ سائیکل سوار نے جلدی سے بچے کو بیس روپے دیے۔ بچہ فوراً چپ ہوگیا اور بولا: ''انکل آپ پھر کب آئیں گے؟''

مرسلہ: طٰہٰ سلیم، کراچی

☆......☆

معصومیت

بچہ اپنے ابو سے: ''ابو آپ نے جو پودے لگائے تھے وہ سب بیکار ہیں، کسی کی بھی جڑیں نہیں نکلیں۔''
ابو نے حیرت سے پوچھا: ''تمھیں کیسے معلوم؟''
بچے نے معصومیت سے جواب دیا: ''کیونکہ میں انھیں روز اُکھاڑ کر دیکھتا ہوں۔''

مرسلہ: محمد عمر، کراچی

☆......☆

گھنٹی

استاد: ''علی تم روز دیر سے اسکول کیوں آتے ہو؟ تمھیں پتا ہے نا کہ اسکول کی گھنٹی آٹھ بجے لگتی ہے۔''
علی: ''جناب آپ گھنٹی لگا دیا کریں میرا انتظار نہ کیا کریں۔''

مرسلہ: نامعلوم

☆......☆

جعلی نوٹ

انعامی لطیفہ

آدمی: ''سر یہ پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کردیں۔''
بینکر: ''یہ تو جعلی نوٹ ہیں!''
آدمی: ''تو آپ کو اس سے کیا، میں تو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہا ہوں آپ کے اکاؤنٹ میں تھوڑی۔''

مرسلہ: حمزہ خلیل، کراچی

☆......☆

منزل

ایک بس ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے لکھا ہوا تھا: ''رب نے چاہا تو منزل تک پہنچا دوں گا، اگر آنکھ لگی تو رب سے بھی ملوا دوں گا۔''

مرسلہ: نامعلوم

☆......☆

پیٹ میں چوہے

شہری مہمان (دیہاتی میزبان سے): ''جلدی سے کوئی کھانے کی چیز لے آؤ، میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔''
دیہاتی (واپس آکر): ''یہ لو چوہے مار گولیاں کھا لو، جلدی کھانا تیار ہوجائے گا۔''

مرسلہ: قمر ناز دہلوی، کراچی

☆......☆

کنجوس زمیندار

ایک کنجوس زمیندار نے اپنے کسان سے ایک کتا لانے کو کہا۔ کچھ دن بعد کسان ایک موٹا تازہ کتا لے کر حاضر ہوگیا۔ زمیندار نے منھ بنا کر کہا: ''یہ تو بہت موٹا

ہے، مجھے دبلا پتلا کتا چاہیے۔"

کسان نے ہنس کر کہا: "حضور فکر مت کیجیے آپ کے پاس رہے گا تو خود ہی دُبلا ہو جائے گا۔"

مرسلہ: اریبہ بتول، کراچی

☆......☆

موٹا دوست

ایک صاحب نے اپنے بے حد موٹے دوست سے کہا: "یار تم جیسے موٹے آدمی عام طور پر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں کیا وجہ ہے کہ انھیں بُرا کہو تو ہنس کر ٹال دیتے ہیں؟"

موٹے دوست نے جواب دیا: "بھائی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیے لڑنا اور بھاگنا دونوں مشکل ہیں۔"

مرسلہ: حمزہ خلیل، کراچی

☆......☆

غلط ٹرین

ٹرین میں سفر کے دوران تین بچے دروازے کے قریب کھیل رہے تھے۔اس دوران ٹکٹ چیکر پہنچ گیا۔اس نے بچوں کے والد کو ہدایت کی کہ بچوں کا خیال رکھیں ورنہ کوئی افسوسناک حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

باپ نے کہا: "اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ اور کیا ہوگا، میری بیوی ہسپتال میں ہے، اور میں اپنی بیمار ساس کے ہاں جا رہا ہوں، ایک بچے نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر انگلی زخمی کر لی، دوسرے نے میرا بٹوا باہر پھینک دیا، اور وہ تیسرا ٹکٹ کو پھاڑ چکا ہے، اس پر ستم یہ کہ افراتفری میں ہم غلط ٹرین میں سفر کر رہے ہیں۔"

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆......☆

مکھیاں

انعامی لطیفہ

ایک شخص انگور بیچ رہا تھا لیکن آواز لگا رہا تھا: "آلو لے لو، آلو لے لو۔"

کسی نے کہا: "جناب یہ تو انگور ہیں۔"

اس پر اُس شخص نے کہا: "خاموش رہو، ورنہ مکھیاں آ جائیں گی۔"

مرسلہ: حافظ عبدالعزیز، کراچی

☆......☆

چوٹ

جج ملزم سے: "تم نے اپنے پڑوسی کے دل کو چوٹ پہنچائی ہے۔جس پر یہ عدالت تمھیں تین ماہ کی سزا سناتی ہے۔"

ملزم: "پھر تو آپ کو چھ ماہ کی سزا ہونی چاہیے۔"

جج: "وہ کیسے؟"

ملزم: "وہ ایسے کہ جتنی چوٹ میں نے اپنے پڑوسی کے دل کو پہنچائی ہے اُس سے دُگنی آپ نے میرے دل کو پہنچائی ہے۔"

مرسلہ: بسمہ شانزے پارس، کراچی

☆......☆

ڈراما

باغ کا مالی

محمد الیاس نواز

بھلا مالیوں کے باغ پر پیدائشی حقوق کیسے ہو گئے......

کردار:

چودھری منصف: گاؤں کا سربراہ (وڈا چودھری)

چودھری عبدالمالک: باغ کا مالک

ندیم، سلیم، کلیم: باغ کے مالی

ماسٹر فراست: گاؤں کے اسکول میں استاد

دینو: چودھری منصف کا گھریلو ملازم

پس منظر

چودھری عبدالمالک نے اپنے باغ کے تینوں مالیوں کو ان کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔ اب یہ تینوں مالی جو آپس میں بھائی ہیں، بحالی کی درخواست لے کر چودھری عبدالمالک کے گہرے دوست اور گاؤں کے بڑے چودھری، چودھری منصف کے

پاس آئے ہیں۔

منظر

چودھری منصف کی بیٹھک ہے۔ چار پائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ ایک چار پائی پر چودھری منصف اُونچے شملے والی خوب صورت پگڑی باندھے پُر وقار انداز میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ حقہ سامنے رکھا ہے۔ سامنے والی چار پائی پر ماسٹر فراست جناح ٹوپی لگائے بیٹھے ہیں جبکہ دو چار پائیاں مزید موجود ہیں۔ دینو بیٹھک میں داخل ہوتا ہے۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

دینو: ''چودھری جی ...وہ جی... چودھری عبدالمالک کے باغ کے مالی تھے نا جی ...عبدالکریم مرحوم...ان کے تینوں بیٹے آئے ہیں جی..آپ سے ملنے۔''

چودھری منصف: ''ہاں، ہاں بھیج دو دینو...''

دینو: (واپس مڑتے ہوئے) ''اچھا جی!''

ندیم، سلیم، کلیم: (اندر داخل ہوتے ہوئے) ''السلام علیکم وڈے چودھری جی...''

چودھری منصف: (پرتپاک انداز میں) ''آؤ آؤ بھئی....سناؤ پتر کیا حال ہے تم لوگوں کا.. ہیں..بھئی ٹھیک تو ہونا تم لوگ... ہیں.....بیٹھو بیٹھو شاباش...''

ندیم: (نیاز مندی کے ساتھ) ''بس جی اللہ کا بہت کرم ہے جی....وڈے چودھری جی!...آپ سنائیں جی...آپ ٹھیک ہیں نا جی؟''

چودھری منصف: ''لو بھئی مجھے کیا ہونا ہے بھلا....اللہ کا فضل ہی فضل ہے...سناؤ بھئی لڑکو!..آج کیسے آنا ہوا...ویسے تو تم لوگ آتے نہیں اور آج تینوں اکٹھے ہی آگئے او....ہاہاہا..اکٹھے تو تم کبھی عید ملنے بھی نہیں آئے.. ہیں....او خیر تو ہے ناں؟''

ندیم: ''بس جی کیا بتائیں آپ کو چودھری جی....آپ کو تو پتا ہے جی ...کہ ہم تین نسلوں سے چودھری عبدالمالک کے باغ کے مالی چلے آرہے ہیں جی... اب آپ کو پتا ہو کہ نہ ہو...چودھری عبدالمالک صاحب نے ہمیں باغ کے مالی کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے جی۔''

چودھری منصف: (تعجب سے) ''اچھا...مگر یہ کب ہو یا؟...اور تم لوگوں نے بتایا کیوں نہیں؟''

ندیم: (منت والے انداز میں) ''وہ جی..کل ہی ہوا ہے ...بس چودھری جی....عبدالمالک صاحب تو جی آپ کو بڑا بھائی کہتے ہیں اور آپ کی بات تو وہ ٹالتے ہی نہیں......بس جی اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں جی کہ آپ مہربانی فرما کر ہماری سفارش کر دیں جی... دیکھیں ناں جی...۔ہم تین نسلوں سے اس باغ کی خدمت کرتے آرہے ہیں جی....آپ کو تو پتا ہے جی کہ ہمارے دادا جی کے ہاتھوں یہ باغ آباد ہوا، پھر ابا جی بھی ساری عمر اسی باغ کی دیکھ بھال میں گزار کر دنیا سے چلے گئے اور ہم بھی اسی کی مالی گیری میں جوان

ہوئے ہیں جی...تو ہمارا تو اس پر پیدائشی حق ہوا ناں
جی....ہمارے ہوتے ہوئے بھلا کوئی کیسے اس باغ
میں ہماری ذمہ داریاں سنبھال سکتا ہے.....بڑے
چودھری جی!...آپ ہی بتایئے کیا چودھری عبدالمالک
صاحب نے ہمارے ساتھ زیادتی نہیں کی جی ی
ی؟...اور ایک بات اور بھی کہوں چودھری جی....وہ یہ
کہ نئے آنے والے مالی مسلمان بھی نہیں ہیں جی...."

(دینو اندر داخل ہوتا ہے)

دینو:"وہ جی...چودھری عبدالمالک صاحب آئے
ہیں جی...."

چودھری منصف:ہاں،ہاں..بھیج بھئی اندر بھیج...اور
مہمانوں کی خاطر کا کوئی بندو بست کر بھئی...کوئی
دودھ شودھ پلا بھئی مہمانوں کو وو..."

دینو:"جی چودھری جی....ابھی لایا جی.."

چودھری عبدالمالک:(اندر داخل ہوتے ہوئے خوش
اخلاقی کے ساتھ)"اسلام لے کم..وڈے چودھری
جی..کیا حال ہے جی...خیر سے ہیں...ماشاءاللہ ماسٹر
جی بھی موجود ہیں....کیسے ہیں جی..ماسٹر جی؟"

چودھری منصف:"او آؤ چودھری عبدالمالک.....اللہ کا
کرم ہے ...او تم سناؤ بھئی....خیریت ہے ناں....
بڑے موقع پہ آئے ہو.....مجھے تمھیں بلانا ہی پڑنا
تھا..."

ماسٹر فراست:"اللہ کا بڑا فضل ہے جی....اللہ سلامت
رکھے..تم سناؤ،اچھا ہوا تم سے ملاقات ہوگئی،کافی دن
ہوگئے تھے ناں ملے ہوئے..."

چودھری عبدالمالک:(ہنستے ہوئے)"ہاہاہا...بس
جی!میں نے ان لڑکوں کو بڑے چودھری جی کی طرف
آتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ میری شکیت ہونے
جارہی ہے.....ہاہاہا...بس فیر میں وی ان کے پیچھے
چلا آیا."

منصف:(ہاتھ تھوڑا سا اوپر اُٹھاتے ہوئے)"اونہیں
اوئے چودھری....ان بے چاروں نے کیا شکیت کرنی
ہے.....یہ تو بے چارے درخاست کرنے آئے
تھے.....دیکھو ناں چودھری..آخر تین پشتوں سے یہ
تمھارے مالی ہیں....اور اب تم نے ان کو باغ سے
نکال ای دیا اے؟"

مالک:"وڈے چودھری جی!....میں نے ان کو باغ
سے نکالا نئیں اے جی..صرف ان کو ان کی ذمہ
داریوں سے فارغ کیا اے جی.... ویسے وڈے
چودھری جی اِک بات تو بتائیں جی.... مالی کا کام بھلا
کیا ہوتا اے....اور ایک مالک اپنے باغ کے مالی سے
کیا چاہتا ہوتا اے جی...؟"

منصف:"لو بھلا یہ کیا سوال ہوا......بھئی مالک یہی
چاہے گا کہ ہر طرح سے باغ کو سنوارا جائے،نئی اور
خوبصورت کیاریاں بنائی جائیں.... راستے ٹھیک
رکھے جائیں....باغ میں پھولوں والے پودے

لگائے جائیں....جن کی خوشبو سے نہ صرف باغ مہکتا رہے بلکہ حسین بھی نظر آئے.....پھلوں والے درخت لگائے جائیں...ہر کام سلیقے اور ترتیب سے کیا جائے...جھاڑیوں اور خودرو پودوں کو کاٹا جائے.... باغ کی حفاظت کی جائے..بس یہی کام ہے چودھری مالیوں کا اور یہی کچھ مالک چاہتا ہوتا اے...''

چودھری عبدالمالک:''بالکل ٹھیک کہا جی آپ نے...مگر وڈے چودھری جی....اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا تو مجھے بھلا کیا دشمنی تھی اپنے پرانے مالیوں سے جی....کہ میں ان کو فارغ کر کے نئے مالیوں رکھنے کا تجربہ کرتا جی..''

ماسٹر فراست:''کیا مطلب چودھری عبدالمالک؟''

چودھری عبدالمالک:(افسوس ناک لہجے میں)''ماسٹر جی....تے....وڈے چودھری جی...اب ذرا میرے جنگل کا چکر لگا کر دیکھیں جی...جو پہلے باغ تھا..... اب اس کا کیا حال ہے...سارا باغ گندگی کا ڈھیر بنا پڑا ہے جی...باغ میں بنے سارے خوبصورت راستے اور روشیں ٹوٹ نہیں گئیں بلکہ تباہ ہو گئیں ایں جی.... باغ کا آدھا حصہ پانی کا ٹویا (جوہڑ) بنا ہوا اے.... اور آدھا باغ پانی کی بوند بوند کو ترس رہا اے...پھلوں والے پودوں کا تو نام نشان نہیں ... ہاں! جنگلی بوٹیاں آپ کو چاہئے ہوں تو میرا جنگل حاضر اے جی ... پھلوں والی بیلوں کی جگہ امر بیل پھل دار درختوں پر ایسی چڑھی کہ سارے درختوں کو کھا گئی.....اب ذرا حفاظت کا سن لیں جی.....دنیا جہاں کے لوفر لفنگیوں کی بیٹھک اگر کہیں ہے تو میرے باغ میں ہے.....وہ نہ صرف ماحول خراب کرتے ہیں بلکہ باغ کا نقصان بھی کرتے ہیں اور یہ تینوں اس میں برابر کے شریک ایں جی...رہی سہی کسر جانور نکال جاتے ایں جی..اسی لئے میں نے کہا کہ میرے جنگل کا چکر لگائیں....ایسی ہوتی اے مالی گیری...اب فیصلہ آپ کریں جی.....''

چودھری منصف:(سمجھانے والے انداز میں)''مگر چودھری مالک!....یہ ساری بدانتظامی اپنی جگہ.... مگر یہ تین پشتوں سے یہاں مالی ہیں اس لیے انکا کہنا ہے کہ باغ پر ان کا پیدائشی حق اے....''

چودھری عبدالمالک:(ہنستے ہوئے)''ہاہاہا.....وڈے چودھری جی....آپ بھی کمال کرتے ہیں جی ی ی... بھلا مالیوں کے باغ پر پیدائشی حقوق کیسے ہو گئے جی....دادا حضور نے یہ باغ نہ تو ان کے لیے لگوایا تھا اور نہ ہی ان کے دادا محترم کو بیچا تھا تو پھر پیدائشی حقوق کیسے ہو گئے جی؟......میرے دادا جی نے ان کے دادا محترم کو ان کی صلاحیت اور دیانت کی وجہ سے ملازم رکھا تھا جی....ان کے والد صاحب بھی قابل اور محنتی انسان تھے جی....اسی لئے وہ بھی برقرار رہے.... مگر یہ لڑکے نا قابل، کام چور اور خائن نکلے....پھر بھی انہوں نے جب تک زیادہ بگاڑ نہیں کیا میں نے ان کو

برداشت کیا جی... مگر اب تو انہوں نے باغ برباد ہی کر دیا تو اس کے سوا کیا چارہ تھا جی... اور رہی بات حقوق کی ...تو ملازم کا حق تو اس کی خدمت اور کام کے ساتھ ہوتا ہے... جب تک وہ کام کرتا رہتا ہے ...خدمت اور انتظام کا حق اسی کا ہوتا ہے... اور جب وہ کام دیانت اور محنت سے کرنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ خدمت کا حق کھو دیتا جی.. تین نسلوں سے کیں ہزار نسلوں سے بھی مالی گیری کرنے سے باغ مالی کی ملکیت نہیں ہو جاتا... اسی لئے ان کا پیدائشی حق کہاں سے ہو گیا جی ی ی؟''

ماسٹر فراست: ''وہ تو بات ٹھیک اے تمھاری چودھری عبدالمالک... مگر ایک دم سے تو کسی کو نہیں نکالا جاتا نا .... پہلے تنبیہ کی جاتی اے... نصیحت کی جاتی ہے... بتایا جاتا ہے کہ تم اپنی ذمہ داریاں ٹھیک نہیں ادا کر رہے.... چھوٹی موٹی سزا دی جاتی اے۔''

چودھری عبدالمالک: ''ماسٹر جی! ایہ کام میں کئی سالوں سے کرتا آیا ہوں جی.... ہر طرح سے کوشش کی... وڈے چودھری جی کو پتا ہے اس بات کا ماسٹر جی ی ی۔''

ماسٹر: (حیرانی سے) ''تو پھر تم نے انہیں پہلے کیوں نہیں نکالا؟''

چودھری عبدالمالک: ''ماسٹر جی ... جب تک کوئی اچھا مالی نہیں ملتا... میں ان کو کیسے فارغ کر سکتا تھا... بغیر دیکھے بھالے اگر لے آتا کسی کو تو پھر ان کو فارغ کرنے کا کیا فائدہ ہوتا؟... بس جیسے ہی بہتر مالی ملے اور مجھے لگا کہ یہ باغ کو دوبارہ سنوار سکتے ہیں تو اُن کو ان کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔''

چودھری منصف: (ہلکی ناراضی کے ساتھ) ''چودھری عبدالمالک!... تمھاری ہر بات ٹھیک ہے مگر تم نے یہ کیا کیا؟؟... کہ مسلمانوں کو فارغ کر کے غیر مسلم مالی رکھ لئے ہیں... کیا بات مناسب اے چودھری؟''

چودھری عبدالمالک: ''وڈے چودھری جی!... باغ کے مالک کو اس سے کیا غرض کہ مالیوں کا دین مذہب کیا ہے جی... میں نے کون سا ان سے مذہبی کام لینا ہے جی.... باغ کا مالک تو ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ کون سا مالی باغ کے بگاڑ کو کم کر کے زیادہ سنوار سکتا ہے.... اور ماسٹر جی آپ ہی ذرا بتائیں ناں جی.... خیانت کار مسلمان کا کتنا ایمان باقی رہ جاتا ہے... اس پر بھی ذرا غور فرمائیں ناں جی۔''

چودھری منصف: (ماسٹر فراست سے مخاطب ہوتے ہوے) ''لو جی ماسٹر جی!... ساری گل بات آپ کے سامنے آ گئی اے جی... آپ پڑھے لکھے انسان ایں جی... کیا فرماتے ایں آپ؟''

ماسٹر فراست: (چشمہ ٹھیک کرتے ہوے، بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ) ''چودھری جی!... یہ زمین اللہ کا باغ ہے جی... اور یہ حکمران اس کے مالی .... جو جتنے

حصے پر حکم ران ہے سمجھاتے حصے کا مالی ہے۔۔۔اس باغ یعنی زمین کا مالک بھی "بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا"۔ باغ کا مالک ہونے کی حیثیت سے خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے باغ کے مالی (حکم ران) اس کی دی ہوئی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے پوری محنت اور دیانت کے ساتھ اس کے باغ (زمین) کو سنواریں، اسی لیے جن مالیوں میں بنانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، وہ مالک انہیں کو مالی مقرر کرتا ہے۔ پھر وہ ان کی نگرانی کرتا ہے۔ جب تک وہ بناتے زیادہ ہیں اور بگاڑتے کم ہیں تو وہ انہی کو مالی رکھتا ہے اور جب ان کا بگاڑ زیادہ ہو جاتا ہے اور بناؤ کم ہو جاتا ہے تو وہ ان کی جگہ ایسے مالی لے آتا ہے جو ان سے زیادہ محنتی اور قابل ہوتے ہیں اور بنانے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور یاد رکھنا چودھری جی۔۔۔۔ وہ باغ کا مالک مالیوں کا کام دیکھتا ہے ان کا دین یا مذہب نہیں دیکھتا۔۔۔۔ان کا کام اچھا ہو تو اپنے باغ کا انتظام اور اختیار ان کو دے دیتا ہے۔ پھر وہ پہلے والے مالیوں کو نئے آنے والے مالیوں کے ماتحت "خدمت گار" کے طور پر کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اگر وہ خدمت گار کے طور پر بھی نا اہل ثابت ہوں تو پھر انہیں باغ سے ہی نکال دیتا ہے جی۔۔۔۔آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے جی۔۔۔۔آپ تو ویسے ہی تاریخ کے شوقین ہیں۔۔۔۔اور باغ کے مالک نے یہ باغ جب سے لگایا ہے اسی وقت سے اس کا یہ اصول اسی طرح اٹل ہے جیسے کائنات کے دوسرے اصول۔۔۔ جیسے جوانی کے بعد بڑھاپے اور پھر موت کا اصول اٹل ہے اور آج تک بدلا نہیں اور نہ بدلے گا۔۔۔۔اسی طرح یہ اصول بھی اٹل ہے۔۔۔نہ بدلا ہے نہ بدلے گا۔۔۔۔اب فیصلہ آپ کیجیے۔۔۔۔

چودھری منصف: (پر جوش انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے، باقی سب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں)

چودھری منصف: (ندیم، کلیم، سلیم سے مخاطب ہو کر) جاؤ پتر۔۔۔نئے آنے والے مالیوں کے ماتحت خدمت گار بن کر کام کرو اور اپنے آپ کو منواؤ۔۔۔۔ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باغ سے ہی نکال دیے جاؤ۔۔۔۔جلدی جاؤ تم اپنے باغ کی طرف اور اللہ نے ہمیں جس باغ کا مالی بنایا ہم اس باغ کی طرف۔۔۔۔۔

(پردہ گرتا ہے۔۔۔۔۔)

☆۔۔۔۔☆

نوٹ: اس ڈرامے میں کرداروں کی مناسبت سے مکالموں کی زبان تبدیل کی گئی۔

مشکل الفاظ کے معانی

مُنصِف: انصاف کرنے والا

مالی گیری: باغبانی کرنا

خودرَو: اپنے آپ اُگا ہوا

خائن: خیانت کرنے والا

تنبیہ: تاکید، نصیحت، خبردار کرنا
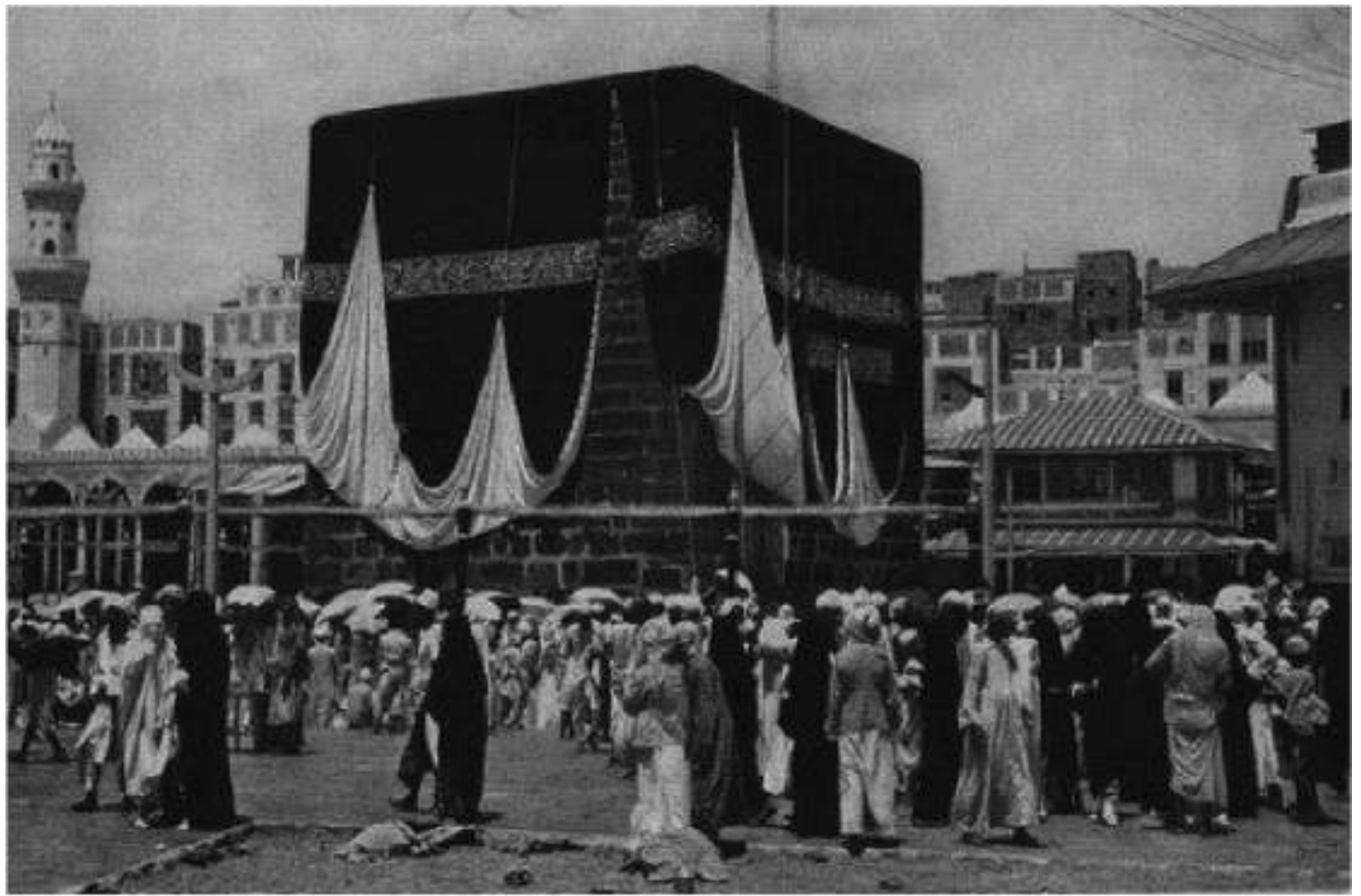
خلیفہ اور عالم

عبدالوارث ساجد

ہشام خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا بھائی تھا۔
ایک بار حج کے موقع پر وہ مکہ آیا۔ حج کے ایام میں مکہ شہر میں بہت رش تھا۔ ہر طرف سے لوگ حج بیت اللہ کے لیے مکہ آئے ہوئے تھے۔

ہشام بن عبدالملک بھی حج کرنے ہی مکہ آیا تھا۔ اس کی مکہ آمد کی وجہ سے گورنر مکہ نے ہشام کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا تھا حفاظتی دستہ اور خدمت گار، ہر وقت ہشام بن عبدالملک کے ساتھ رہتے تھے۔

جس طرف بھی ہشام جاتا، اسے خصوصی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ حفاظتی دستہ اس کی حفاظت کے پیش نظر عام لوگوں کو رستے سے ہٹا دیتا تھا۔

ایک روز ہشام بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا، ذرا آگے ایک آدمی نہایت ہی عاجزی سے اپنا جوتا ہاتھ میں اُٹھائے طواف کرنے میں مصروف ہے۔

ہشام بن عبدالملک نے آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ سالم بن عبداللہ تھے۔

سالم سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔

نہایت ہی متقی اور پرہیزگار انسان تھے اور اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ ہشام بن عبدالملک سے بے خبر طواف کعبہ میں مصروف تھے۔ ان کے جسم پر ایک کپڑا اور ایک عمامہ تھا۔ جو بہت مہنگا بھی ہوا تو تیرہ درہم سے زیادہ کا نہ تھا۔

دوسری طرف ہشام بن عبدالملک کے بدن پر قیمتی احرام تھا۔ اس کا حفاظتی دستہ، خدمت گار اور جاہ و جلال اپنی جگہ تھا۔ ہشام بیت اللہ کے اندر ہی سالم بن عبداللہ کے قریب ہوا اور بولا: ''کوئی حاجت ہو تو بتایئے؟'' سالم بن عبداللہ نے کہا۔

''مجھے اللہ سے شرم آ رہی ہے کہ میں اس کے گھر میں ہوتے ہوئے کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کروں۔''

یہ سننا تھا کہ خلیفہ کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے سالم بن عبداللہ کے جواب میں اپنی بے عزتی محسوس کی۔ حفاظتی دستے کے اہلکاروں نے بھی خلیفہ کی بے عزتی محسوس کی۔ جب سالم بن عبداللہ حرم شریف سے باہر نکلے تو خلیفہ بھی ان کے پیچھے ہی حرم سے نکل پڑا اور راستے میں ان کے سامنے آ کر کہنے لگا۔

''اب تو آپ بیت اللہ سے باہر نکل چکے ہیں کوئی حاجت ہو تو عرض کریں، بندہ حاضر ہے مجھے خوشی ہوگی۔''

سالم بن عبداللہ نے ایک نظر ہشام کی طرف دیکھا، پھر بولے: ''آپ کی مراد دنیاوی حاجت سے ہے اور اخروی حاجت سے؟''

خلیفہ ہشام بولا: ''شیخ محترم! آپ خوب جانتے ہیں کہ اخروی حاجت کو پوری کرنا تو میرے بس میں نہیں البتہ دنیاوی ضرورت پوری کر سکتا ہوں، فرمائیں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

سالم بن عبداللہ کہنے لگے: ''ہشام! میں نے دنیا تو اس سے بھی نہیں مانگی ہے جس کی یہ ملکیت ہے، پھر بھلا میں اس شخص سے دنیا کیوں کر طلب کر سکتا ہوں جس کا وہ خود مالک نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف چل دیے اور ہشام بن عبدالملک اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

متقی: خدا سے ڈرنے والا، گناہوں سے بچنے والا

پرہیزگار: احتیاط کرنے والا

اِحرام: بڑی سفید چادر جس کو حج کے دوران پہنا جاتا ہے

قائدِ اعظم

ایک بچے کا اسکول میں نیا نیا داخلہ ہوا۔

ٹیچر: ''بتاؤ قائدِ اعظم کون ہیں؟''

بچہ: ''مجھے کیا معلوم میں تو خود نیا نیا داخل ہوا ہوں، یہیں کہیں ہوں گے کلاس میں۔''

مرسلہ: گل خان، کراچی

بن گئے بادل

یہ چیزیں اپنے پاس رکھیں:
ایک بڑا سا جار ڈھکن کے ساتھ
پسا ہوا چونا (چونے کا پاؤڈر)
ایک گول گردن کٹا غبارہ (غبارے کی گردن کو قینچی سے کاٹ لیں)۔
ایک باریک ربر بینڈ
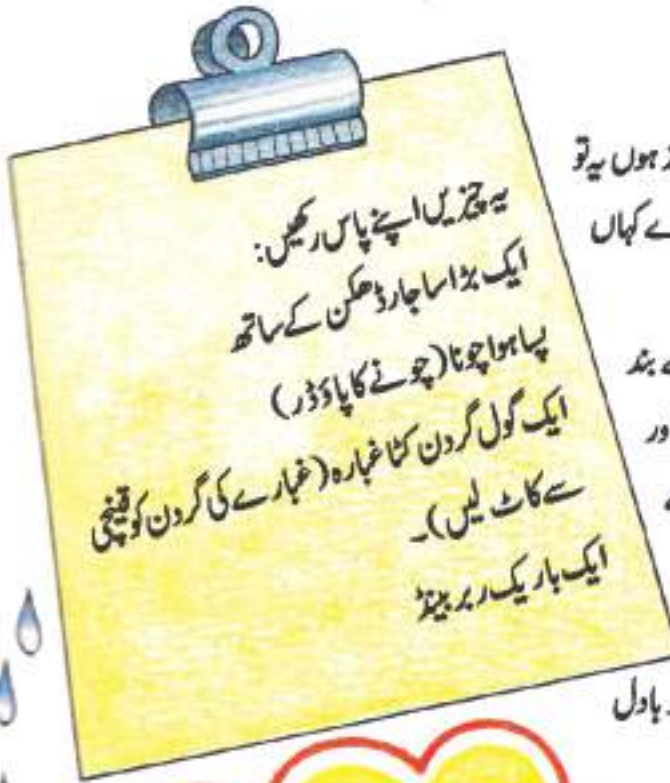
السلام علیکم دوستو! اپریل کے مہینہ میں آپ بارش سے لطف اندوز ہوں یہ تو مشکل ہے لیکن آپ بادل بنا کر کچھ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ارے کہاں جا رہے ہیں آپ؟ پہلے سیکھ تو لیں بادل کیسے بنتے ہیں۔

۱۔ تھوڑی سی مقدار میں پانی جار میں ڈالیں۔ ڈھکن کو مضبوطی سے بند کر کے ۲۰ منٹ کے لیے اسے بھول جائیں۔ ۲۔ ڈھکن کھولیں اور جار میں کچھ چونے کا پاؤڈر ڈالیں۔ ۳۔ جلدی سے غبارے سے جار کو ڈھانپ کر ربر بینڈ سے بند کر دیں۔ ۴۔ اب غبارے کو نیچے کی طرف دبائیں تا کہ ہوا سکڑ کر نیچے جمع ہو جائے۔ بیس سیکنڈ تک غبارے پر دباؤ رکھیں۔ اس کے بعد غبارہ جار سے ہٹا کر بادل دیکھیں اور اپنے دوستوں کو بھی دکھائیں۔

ایسا کیوں ہوا؟

جب پانی ٹھنڈا ہو کر ہوا میں بخارات کی شکل اختیار کرتا ہے تو بادل بنتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا زیادہ بخارات والے پانی کو نہیں روک سکتی اس لیے اس میں سے کچھ بخارات جم کر بادل بن جاتے ہیں۔ جب آپ جار میں ہوا کو دبائیں گے، ہوا گرم ہو کر اور زیادہ بخارات جذب کرے گی۔ اب آپ جار کے منہ سے غبارہ ہٹائیں گے تو ہوا ٹھنڈی ہو جائے گی اور کچھ بخارات چونے کے پاؤڈر پر جم جائیں گے جس کی وجہ سے آپ بادل بنا سکیں گے۔
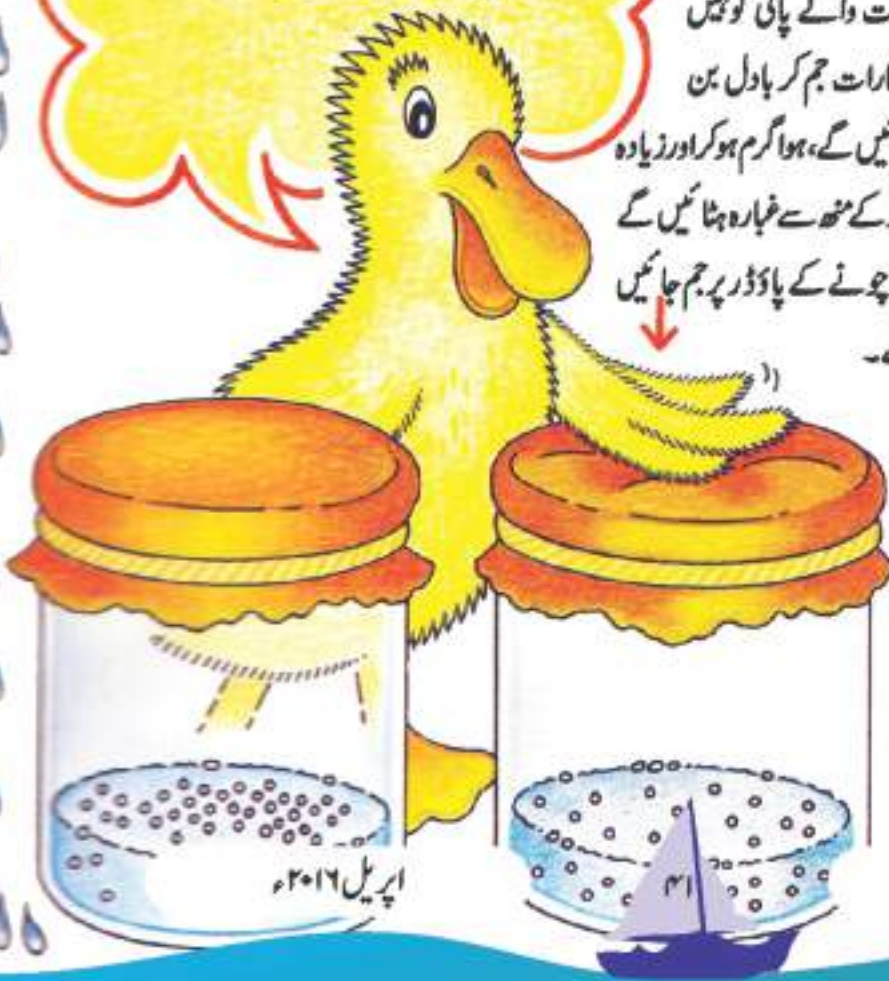
یومِ ارض
پر عالمی مصوروں کے خیالات
آہ میں کتنی خوبصورت تھی
MEMORIES
اف میرا درجہ حرارت
تو بہت بڑھ گیا ہے
سائیکل تو اچھی چلاتے ہو لیکن یہ حرکت اچھی نہیں ہے
کم از کم سالگرہ کے دن کا ہی خیال کر لیتے
HAPPY EARTH DAY

اتنا کوڑا دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے
کیا آپ میری گھبراہٹ دور کرسکتے ہیں؟

یوم ارض کی تقریب کے بعد کا منظر

شکر ہے یوم ارض پر کانفرنس بہت اچھی ہوگئی

یہ تو بہت اچھے بچے ہیں

آہ! اب میں نہیں بچوں گی

گپی نورنگ

احمد عدنان طارق

**نورنگ نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے
اپنی شامت کو آواز دی تھی**

نورنگ بڑا ہی گپی بونا تھا۔ اس کی اس
عادت کی وجہ سے کوئی اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر روز
اس کے پاس دوسرے لوگوں کے متعلق ہانکنے کے لیے
سیکڑوں گپیں ہوتیں۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی
نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے متعلق ایسی بُری باتیں ان کی
پیٹھ پیچھے کرتا رہتا کہ وہ اب سب نورنگ سے ناراض
رہنے لگے تھے۔

کیا ہم اس گپی بونے کا کچھ کر سکتے ہیں؟ جس سے یہ
اپنی اس بُری حرکت سے باز آ جائے ورنہ اس بُری
حرکت کے علاوہ اس میں کوئی اور برائی نہیں ہے۔
لیکن دوستوں کے کوسنے بھی نورنگ کو اس بُری حرکت
سے باز نہیں رکھ سکے تھے۔ وہ ہر وقت لوگوں کے متعلق
جھوٹی باتیں پھیلاتا رہا۔

جیسے اس نے نامی کے متعلق سب کو بتایا کہ میں نے کل
اسے مارکیٹ میں شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔ بے
چارے نے پھٹی ہوئی جرابیں پہن رکھی تھیں یا یہ کہ بنٹی
نے ہفتہ بھر اُدھار چاکلیٹ لے کر کھائے اور ابھی تک
دُکان دار کا بل ادا نہیں کیا۔ اس کی سبز آنکھیں کچھ ں

کی طرح اِدھر اُدھر کوئی کہانی تلاش کرتی رہتیں اور اس کی ناک اتنی لمبی تھی کہ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں گھس جاتی لیکن پھر بُری حرکتوں کا خمیازہ بھگتنے کا وقت بھی آ گیا۔

خالہ صرصر بیمار تھیں تو ان کا بھانجا دراز قد ان کی تیمارداری کے لیے نورنگ کے گاؤں آ گیا۔ اس کا نام اس کی لمبائی کی وجہ سے 'دراز قد' پڑ گیا تھا۔ درحقیقت وہ ایک جادوگر بھی تھا۔ دراز قد کی عادت تھی کہ وہ اپنے سونے والے کپڑوں میں ہی صبح سویرے اُٹھ کر اپنے باغیچے میں چہل قدمی کرتا تاکہ تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر سکے۔

نورنگ نے اپنی کھڑکی سے اسے سیر کرتے دیکھا تو چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ دراز قد کے لمبے گھنگھریالے بال تیز ہوا سے اس کے ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ اچانک اس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جس سے وہ حیران رہ گیا۔ تیز ہوا کی وجہ سے دراز قد کے گھنگھریالے بال اس کے سر سے ہوا میں بلند ہو کر اُڑتے ہوئے ایک جھاڑی میں اُلجھ گئے اور نیچے سے دراز قد کا گنجا سر برآمد ہو گیا۔

نورنگ کے منھ سے بے اختیار نکلا کہ واہ تو یہ صاحب نقلی بال لگائے پھر رہے ہیں اور ان کا سر بالوں کے بغیر بالکل اس طرح صاف ہے جیسے چھیلا ہوا مٹر کا دانہ۔ دراز قد بھی پریشان ہو گیا کہ اس کے نقلی بالوں کا راز فاش نہ ہو جائے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے اسے دیکھا تو نہیں مگر اسے نورنگ نظر نہیں آیا۔ پھر وہ بھاگ کر جھاڑی کے پاس گیا اور اسے اپنے نقلی بال اُٹھا کر جلدی سے سر پر لگا لیے۔

نورنگ کے تن بدن میں تو جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اسے دوسروں کو سنانے کے لیے کیا خوب کہانی ہاتھ لگی تھی۔ اس نے جلدی سے کپڑے بدلے۔ ناشتہ کیا۔ سر پر ٹوپی پہنی اور نامی کو بتایا کہ اس نے دراز قد کا مٹر کے چھیلے ہوئے دانے جیسا سر دیکھا ہے۔ وہ مکمل گنجا ہے اور نقلی بال لگائے پھر رہا ہے۔ نامی کا منھ نورنگ کی بات سن کر حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا لیکن پھر بھی اس نے نورنگ کو احتیاط سے کام لینے کو کہا کیونکہ اس قسم کی باتوں سے دراز قد ناراض ہو سکتا ہے لیکن نورنگ کو اپنے انجام کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو سارا دن جوش میں لوگوں سے ملتا رہا اور دراز قد کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ تقریباً چالیس پچاس بندوں سے اس نے بات کی۔

ان میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو شام کو دراز قد کی خالہ کے گھر کسی کام کے لیے گئے اور جاتے ہی انھوں نے خالہ سے دراز قد کے گنجے سر کے متعلق دریافت کر لیا۔ خالہ یہ سن کر حیران رہ گئیں۔ انھیں خود بھی اس حقیقت کا علم نہیں تھا۔ ادھر یہ کانا پھوسیاں دراز قد کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں کیونکہ اس کے کان بہت تیز

تھے۔ وہ یہ باتیں بھی سن رہا تھا اور اب سارے گاؤں کو یہ کہانی معلوم ہو چکی تھی۔

وہ بے چارہ عمر کی وجہ سے گنجا نہیں تھا بلکہ ایک منتر کے اُلٹا پڑ جانے کی وجہ سے اس کے سر کے بال اُڑ گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ میرے متعلق یہ کہانیاں کون گاؤں والوں کو مرچ مسالے لگا کر سنا رہا ہے۔ اس نے اپنی الماری میں سے ایک چاندی کی بڑی سی گیند نکالی اور اسے میز پر اپنے سامنے رکھ لیا۔ پھر اس نے مور کے پر سے اس گیند کو ایک دو ٹھوکے دیے اور بہت مترنم آواز میں ایک منتر پڑھنے لگا۔ منتر کے آخر میں اس نے ایک دفعہ پھر مور کا پر گیند کو لگایا اور اسے کہنے لگا کہ مجھے وہ چہرہ دکھایا جائے جو یہ کہانیاں پھیلا رہا ہے۔

اسی وقت ایک حیران کن واقعہ ہوا۔ چاندی کی گیند کی سطح دھندلی ہونے لگی اور اس میں ایک چہرے کی شبیہ اُبھر آئی۔ دراز قد اسے گھورتا گیا اور شبیہ واضح ہوتی گئی۔ آخر میں نورنگ کا چہرہ مکمل واضح ہو گیا۔

دراز قد نے چہرے سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا ''نورنگ'' پھر دراز قد نے اس کا پتا پوچھا تو جواب آیا کہ تمھارا پڑوسی۔ پھر دراز قد نے مور کے پر سے چاندی کے گیند کو ایک اور ٹھوکہ دیا تو چہرہ غائب ہو گیا اور گیند دوبارہ چاندی کی بن گئی۔

اب دراز قد کی سمجھ میں آ گیا کہ کوئی پڑوسی ہے جس نے باغیچے میں میرے نقلی بال گرنے سے میرا سر اصلی حالت میں دیکھ لیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس نورنگ کے بچے کو کہانیاں گھڑنے کی سزا دے گا۔

اگلے دن وہ ایک چھڑی کی دکان پر گیا۔ اس نے ایک چھڑی خریدی۔ جس کے ہینڈل میں خم تھا۔ لیکن بہت خوبصورت سرخ رنگ کی چھڑی تھی۔ جس کا خمدار ہینڈل پیلا تھا جب پیلے ہینڈل کو موڑا جاتا تو وہ چھڑی سے علیحدہ ہو جاتا تھا۔

دراز قد اُسے لے کر سیدھا اپنی خالہ کے گھر میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر اس نے چھڑی کا ہینڈل علیحدہ کیا اور اس میں نیلے رنگ کا منتر بھرا اور دوبارہ اسے چھڑی پر جوڑ دیا۔ چھڑی کو اپنے ہاتھ میں تھاما اور اسے لے کر نورنگ کے گھر چلا گیا۔ نورنگ نے دروازہ کھولا اور دراز قد کو اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ بلکہ اس کے گھٹنے کانپنے لگے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ دراز قد کی پیٹھ پیچھے اس کے متعلق کیا برائیاں کرتا رہا ہے لیکن خلاف توقع دراز قد نے بڑے تحمل سے نورنگ سے بات کی اور پھر چھڑی نورنگ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے کہا کہ نورنگ میں نے سنا ہے کہ تم بہت بڑے کہانی باز ہو، یہ چھڑی میری طرف سے قبول کرلو۔ یہ کہانی باز اور چغل خور لوگوں کے بڑے کام آتی ہے۔ نورنگ اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ دراز قد کو انکار نہیں کر سکا۔ حالانکہ اسے شک تھا کہ یہ جادو کی

چھڑی ہو سکتی ہے۔ اس کا منھ خوف سے ایسے کھلا تھا جیسے مچھلی پانی سے باہر آ کر منھ کھولتی ہے۔ دراز قد اسے اسی حالت میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے چھڑی کو دیکھا جو بظاہر بالکل بے ضرر دکھائی دے رہی تھی۔
اس نے سوچا کہ اس چھڑی میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ بلکہ وہ چھڑی کو چڑانے کے لیے اس کے سامنے عجیب و غریب چہرے بھی بناتا رہا لیکن چھڑی میں کوئی جنبش نہیں ہوئی جب نورنگ کو چھڑی کے متعلق تسلی ہوگئی۔ تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔
نورنگ نے دروازہ کھولا تو باہر نامی تھا۔ اس نے نورنگ کو اس کی ایک کتاب واپس دینی تھی لیکن نورنگ نے نامی سے کہا کہ تم نے سیاہی گرا کر میری کتاب کا سرورق خراب کر دیا ہے۔ نامی نے نورنگ سے کہا کہ یہ پہلے سے ہی خراب تھا تم نئی کہانی گھڑ رہے ہو۔ ابھی اس کے منھ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ وہ حیرت سے خاموش ہوگیا۔ دراز قد کی دی ہوئی چھڑی جو اب قریبی میز پر پڑی ہوئی تھی۔ چھڑی چھلانگ لگا کر میز سے اُتری اور زور زور سے نورنگ کو مارنے لگی۔
نورنگ کی چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر باورچی خانے میں گھس گیا۔ مگر چھڑی اس کے پیچھے پیچھے تھی اور اتنی دیر تک اس پر برستی رہی جب تک ہر سمت بھاگتے ہوئے نورنگ کے منھ سے بے اختیار معافیاں نکلنا نہیں شروع ہوگئیں۔ تب چھڑی مڑی۔ میز پر لیٹی اور ساکن ہوگئی۔ نامی نے نورنگ کو سمجھایا کہ اب تمھیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ چھڑی تمھیں پیٹ پیٹ کر نیلا اور کالا کر دے گی۔ اگر تم نے لوگوں کے متعلق کہانیاں گھڑنی بند نہ کیں اور کیا چھڑی کی مار والی بات سن کر دنیا بے اختیار تم پر ہنسے گی نہیں؟
نورنگ فوراً نامی کی منت کرنے لگا کہ اس مار کے متعلق وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن وہ ہنستا ہوا باہر بھاگ گیا۔
نورنگ چھڑی سے بہت ناراض تھا، اچانک وہ اس کی طرف دوڑا۔ اسے اُٹھایا اور اٹھا کر باہر باغیچے میں پھینک دیا۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا اور پھر چلا کر چھڑی کو مخاطب کرنے لگا: ”اے فضول چیز! اب یہیں پڑی رہو۔ یہی تمھاری جگہ ہے۔ پھر اس نے چائے پینے کے لیے کیتلی میں پانی ڈال کر چولھے پر رکھ دیا۔ کیونکہ پٹائی سے اس کا سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چائے سے اس کا درد کچھ کم ہو جائے گا۔ مگر تبھی اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کسی کو سنا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بی چھڑی بڑے آرام سے ادھ کھلے دروازے سے اندر تشریف لا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ اپنی پچھلی جگہ پر آ کر آرام سے لیٹ گئیں۔
چائے پینے کے بعد نورنگ کا پروگرام تھا کہ وہ خرید و فروخت کے لیے بازار جائے گا لہٰذا وہ تیار ہو کر بازار

کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ کب چالاک چھتری خاموشی سے نورنگ کے بازو سے اپنے خم والے ہینڈل کے ذریعے لٹک گئی۔ راستے میں وہ ایک غبارے بیچنے والے سے ملا۔ ''میں نے سنا ہے کہ کل خالہ صبار فتار کا بچہ تمھارے دو غبارے چرا کر لے گیا تھا۔ جب تم اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔'' نورنگ نے راز داری سے اُس سے پوچھا۔ اس کا اس طرح بات کرنا تھا کہ جادو کی چھتری دوبارہ ضرب لگانا شروع ہوگئی اور ساتھ ہی پکارنے لگی۔ گپی نورنگ، گپی نورنگ۔

فوراً ہی وہاں خاصے لوگ اکٹھے ہوگئے اور سب ہی گپی نورنگ کی پٹائی ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے شور مچا دیا اور تالیاں بجانے لگے کیوں کہ نورنگ کی کہانیوں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ نورنگ نے چھتری کا مقابلہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن چھتری اس سے کہیں تیز تھی اور آخر کار نورنگ کو وہاں سے دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ وہ سیدھا گھر واپس آیا۔ جادو کی چھتری بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ چپکے سے پھر اس کے بازو سے لٹک گئی اور جب نورنگ نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا تو اسے احساس ہوا کہ محترمہ بھی تشریف لا چکی ہیں۔ ''میں تمھیں اس بات کی سزا دوں گا اب اس بار میں تمھیں ویسے ہی آگ میں جھونک دوں گا۔'' نورنگ بے اختیار روتے ہوئے چھتری سے کہہ رہا تھا۔

وہ باغیچے میں گیا اور سوکھے پتوں کا ڈھیر جمع کر کے اس میں آگ لگا دی، اس نے چھتری اٹھائی اور اسے آگ میں پھینک دیا۔ شعلے مزید بھڑک اُٹھے۔ نورنگ اب بہت خوش تھا کہ چھتری سے اس کی جان چھوٹ گئی وہ واپس گھر آیا اور آرام سے اپنی پسندیدہ کتاب پڑھنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی سکون سے گزری تھی کہ اسے لگا جیسے کوئی پالتو جانور اس کے ساتھ اپنا جسم رگڑ رہا ہے اسے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ چھتری بالکل بھی آگ میں نہیں جھلسی بلکہ دھوئیں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی۔ اب وہی سیاہ رنگ وہ نورنگ کے نئے کپڑوں پر منتقل کر رہی تھی۔ نورنگ نے جھلا کر اسے پرے بھگانا چاہا۔

''اوہ یہ ظالم چھتری۔ میں کیا کروں؟ پہلے ہی اس نے میرے کپڑے خراب کر دیے ہیں۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا لیکن چھتری پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اتنی دیر تک خود کو نورنگ کے کپڑوں سے رگڑا جب تک وہ خود بالکل صاف نہیں ہوگئی۔ مگر اتنی دیر میں نورنگ کے کپڑوں کا کباڑہ ہو چکا تھا۔

اب سخت غصے میں نورنگ نے چھتری کو پانی میں ڈبونے کا سوچا۔ اس نے چھتری کو پکڑا اور گھر سے باہر موجود ایک کنویں میں لے جا کر پھینک دیا لیکن پھر بھی وہ ڈر کے مارے اپنے گھر نہیں گیا۔ بلکہ رات تک اپنی

خالہ کے گھر میں بیٹھا رہا۔ رات کو وہ گھر پہنچا اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ تھوڑی دیر میں وہ بستر پر سویا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔

اچانک وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ اس نے کوئی آواز سنی۔ کوئی گھسیٹتا ہوا کھڑکی سے اندر آ رہا تھا۔ کھڑکی تھوڑی سی کھلی رہ گئی تھی اور پھر اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے بستر میں آ گیا ہے۔ پھر کسی نے اُس سے کہا کہ وہ گیلی ہے اور اسے سخت سردی لگ رہی ہے۔ میں سارے دن کی محنت کے بعد کنویں سے نکل کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ نورنگ کو فوراً پتا چل گیا کہ یہ جادو کی چھڑی کی آواز ہے۔ کیونکہ صبح سے اس آواز کا شور وہ سنتا رہا تھا۔ چھڑی باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ وہ اس سے جتنا دور لیٹ سکتا تھا لیٹا لیکن وہ دوبارہ نزدیک آ گئی۔ نورنگ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے صبح کی مار یاد تھی۔ لہٰذا ساری رات وہ بھی گیلا رہا اور سردی سے کانپتا رہا۔ صبح اس نے لباس تبدیل کیا اور سوچنے بیٹھ گیا۔ آخر اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کلھاڑی سے اس چھڑی کے ٹکڑے کر دے۔ لہٰذا اس نے چھڑی اُٹھائی۔ فرش پر رکھی اور کلھاڑی سے اسے کاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ چھڑی سے کلھاڑی یوں اُچٹ رہی تھی جیسے وہ لوہے کی راڈ ہو۔ دو تین دفعہ اُچٹ کر کلھاڑی اس کے منہ پر لگی آخر ہار کر اس نے کلھاڑی دور پھینک دی۔ چھڑی خود ہی بولی کہ

''نورنگ تم مجھے ختم نہیں کر سکتے اور نہ ہی چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہو۔ تمھیں مجھے برداشت کرنا ہوگا۔''

آخر کار اسے اپنی عادت کے متعلق سوچنا پڑا۔ اب نورنگ لوگوں کے بارے میں اچھی باتیں ہی کرتا تھا۔ آخر اس کو یقین ہوگیا کہ اب چھڑی اس کی ہمیشہ ہمقدم تھی لیکن پھر کبھی اس کی پٹائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک صبح نورنگ کچھ خرید وفروخت میں مصروف تھا چھڑی اس سے علیحدہ ہوئی اور ٹک ٹک کرتی ہوئی تنہا ایک سمت کو روانہ ہوگئی۔ نورنگ نے اسے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

اس نے بتایا: ''وہ کہیں اور قسمت آزمائی کرنے جا رہی ہے کیونکہ اب تم چغل خور اور گپی نہیں رہے۔''

نورنگ نے اسے بہت روکا مگر اس نے بتایا کہ اس کا فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی پٹائی کرے۔ جو دوسروں کے متعلق ان کی پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اب میں کسی اور ایسے شخص کو تلاش کروں گی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ دراز قد کے پاس بھی نہیں گئی جس کے بال اب آہستہ آہستہ اُگ آئے تھے۔

لہٰذا بچو! مجھے اب تمھاری فکر ہے۔ چغل خوری اور لوگوں کی پیٹھ پیچھے باتیں نہ کرنا کیونکہ یہ نہ ہو، وہ جادو کی چھڑی یہ باتیں سن کر تمھارے پاس آ جائے۔

☆......☆

ساتھیو! ہو جائیں تیار...... کیوں کہ ساتھی ایک بار پھر لایا...... ایک نیا اور انوکھا انعامی سلسلہ...... تاریخ کی سیر کیجیے...... مسلم حکمرانوں، سیاست دانوں، سائنس دانوں اور ان شخصیات سے ملیے جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا...... بذریعہ قرعہ اندازی جیتنے والے ساتھیوں کو **اکیڈمک بک سینٹر** کی جانب سے دی جائیں گی ڈھیر ساری کتابیں اور تاریخی سی ڈیز...... تو پھر تیار ہیں ناں آپ...... تاریخ کی کھوج کے لیے......!!

سلطان اپنے والد کا سب سے بڑا فرزند تھا۔ ۲۰ نومبر کو بنگلور میں پیدا ہوا۔ سلطان کے والد نے جنوبی ہند میں ۵۰ سال تک انگریزوں کو اپنی قوت کے بل بوتے پر روکے رکھا۔ سلطان کے والد نے عملی زندگی کا آغاز ایک ہندو راجہ کی فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے کیا۔ جلد ہی اپنی بہادری اور قابلیت کی بنا پر سپہ سالار بن گئے۔ راجہ اور اس کے وزیران کا اثر و رسوخ دیکھ کر ان سے خوفزدہ ہو گئے اور اِن کے قتل کا منصوبہ بنایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس منصوبے پر عمل کرتے سلطان کے والد نے ریاست کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ سلطان کے والد نے اپنے ۲۰ سالہ دورِ اقتدار میں مرہٹوں، نظام دکن اور انگریزوں کا خوب مقابلہ کیا اور انگریزوں کے (چھینے گئے) بہت سے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ بعد میں سلطان کے والد نے نظام دکن اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بنایا لیکن مرہٹوں اور نظام دکن کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کو مکمل شکست نہیں ہو سکی۔ اسی جنگ میں سلطان کے والد کا انتقال ہو گیا اور سلطان نے ۳۲ سال کی عمر میں ریاست کو بحیثیت حکمران و سپہ سالار سنبھالا۔ سلطان کے والد تعلیم یافتہ نہیں تھے جبکہ سلطان ایک تعلیم یافتہ اور باعمل مسلمان تھا۔ نماز کی پابندی اور قرآن کی تلاوت سلطان کے محبوب مشاغل تھے۔ سلطان نے اپنی رعایا سے اخلاقی اور معاشرتی برائیاں دور کرنے کے لیے اصلاحات کا نفاذ کیا۔ سلطان نے رعایا کی ترقی اور خوشحالی کے لیے بنیادی ضرورت کی ہر چیز اپنے ملک میں تیار کرنے کے لیے کارخانے قائم کیے۔ حتیٰ کہ اسلحہ بھی سلطان کے ملک میں تیار ہونے لگا۔ ایک انگریز اُس دور کے بارے میں فرماتا ہے: ’’یہ ہندوستان کا سب سے سرسبز علاقہ ہے۔ یہاں سلطان کی حکمرانی ہے۔ یہاں کے باشندے ہندوستان میں سب سے زیادہ خوشحال ہیں‘‘۔ سلطان کو عربی، فارسی، اردو، فرانسیسی اور انگریزی سمیت کئی زبانوں پر عبور تھا۔ مطالعے کا بہت شوق تھا اور اپنے کتب خانے میں کتابوں کی تعداد کم و بیش ۲۰۰۰ بتائی جاتی ہے۔ سلطان ہندوستان سے برطانوی سامراج کا خاتمہ چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے سلطان نے ترکی، ایران، افغانستان اور فرانس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اپنی آخری جنگ میں سلطان نے انگریزوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور قلعہ بند ہو گیا لیکن غدارانِ ملت نے دشمن کے ساتھ مل کر دروازہ کھول دیا اور دشمن کے حملے کے باعث بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی جس سے مزاحمت کمزور ہو گئی۔ ایک

فرانسیسی افسر نے سلطان کو اپنی جان بچا کر بھاگ جانے کا کہا لیکن سلطان راضی نہ ہوا اور لڑتے لڑتے بالآخر ہندوستان کا یہ اصلاح پسند اور مرد حریت شہادت کا تاج سر پہ سجائے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ انگریز جنرل ہیرس کو جب سلطان کی شہادت کا علم ہوا تو اُس نے خوشی سے نعرہ لگایا: ''اب ہندوستان ہمارا ہے''۔ سلطان کی شہادت کے بعد بھی انگریز سلطان کے جسد خاکی کے پاس آنے سے ڈر رہے تھے۔ سلطان کا ایک مقولہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور آج کل بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ہندوستان میں ۳۵ سال جس طرح سلطان اور اس کے والد نے بے مثال شجاعت اور سمجھداری سے مقابلہ کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ دونوں اس لحاظ سے بھی باقی مسلم حکمرانوں سے ممتاز ہیں کہ آپ نے دورِ زوال میں نئی ایجادوں سے فائدہ اُٹھایا اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فوجی، انتظامی اور سماجی اصلاحات نافذ کیں۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ کو سلطان سے بہت محبت تھی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے سلطان کے مزار پر حاضری دی اور جب ۳ گھنٹے بعد باہر آئے تو آنکھیں شدتِ جذبات سے سرخ تھیں۔ آپ نے اُس وقت فرمایا: ''سلطان کی عظمت کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ وہ مذہب ملت اور آزادی کے لیے آخر دم تک لڑتا رہا یہاں تک کہ اس مقصد کی راہ میں شہید ہوگیا''۔

سوالات:
۱) سلطان اور اس کے والد کا مکمل نام کیا ہے؟
۲) سلطان کی مکمل تاریخ پیدائش اور تاریخ شہادت کیا ہے؟
۳) سلطان کی آخری جنگ میں غداری کرنے والوں کے نام کیا ہیں؟
۴) سلطان کا مشہور قول کیا ہے؟
۵) سلطان کا مقامِ شہادت اور اس جنگ کا نام کیا ہے جس میں سلطان کے والد کا انتقال ہوا تھا؟

کوپن تاریخ کی کھوج (۶)

نام ____________

کلاس ________ فون ________

پتہ ____________

____

ای میل ____________

ہدایات

☆...... پچھلے صفحہ پر دیئے گئے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆...... نیچے دیئے گئے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆...... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کریں۔

☆...... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆...... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتا: F-206 سلیم ایونیو، بلاک 13-B گلشن اقبال، کراچی۔فون:021-4976468

ای میل:monthlysathee@hotmail.com

جوابات

۱ ______________________

۲ ______________________

۳ ______________________

۴ ______________________

۵ ______________________

تاریخ کی کھوج

سلسلہ نمبر ۴

درست جوابات:

☆......ملائشیا

☆......۳۱ اگست ۱۹۵۷ء

☆......جنرل محمد ایوب خان

☆......ڈاکٹر مہاتیر بن محمد

☆......مغرب میں تھائی لینڈ، مشرق میں انڈونیشیا اور برونائی دارالسلام، جنوب میں سنگاپور، جبکہ سمندری حدود ویتنام سے ملتی ہیں۔

بذریعہ قرعہ اندازی پانچ درست جوابات دینے والے انعام یافتگان

وانیہ شیخ (حیدرآباد)　　محمد قاص (حیدرآباد)

نامیہ تحریم (کراچی)　　ناصر احمد (کراچی)　　احمد رضا (کراچی)

ان ساتھیوں نے بھی اچھی کوشش کی:

یاسمین احمد (کراچی)، بلیم (کراچی)، سلمان حسین (کراچی)، کامران عبدالغفور (کراچی)، مہرنساء (کراچی)، سیما (کراچی)، عبدالرزاق محمد ابراہیم (کراچی)، مسکان لیاقت علی (کراچی)، کومل بنت محمد فاضل (کراچی)، گلناز (کراچی)، مصباح (کراچی)، اقراء علی محمد (کراچی) اقراء احمد (کراچی)، عرفان مجید (کوئٹہ)، اسلم خان (پشاور)، فرزانہ عرفان (لورالائی)، نجیب خان (اسلام آباد)، وقار صہیب (سکھر)، مریم جہانگیر (کراچی)، حافظ عبدالعزیز (کراچی)، سلمان حسین (کراچی)، فرحان (کراچی)، گل ناز (کراچی)، ثمینہ (کراچی)، یاسمین احمد (کراچی)، نبیلہ (کراچی)، توصیف الرحمٰن (کراچی)، سنبل (کراچی)، ہانیہ شفیق (کراچی)، سمیع اللہ (کراچی)، عبدالرحمٰن احسام (کراچی)، محمد طیب (کراچی)، کرن (کراچی)، بسمہ (کراچی)، شاہین شفیع (کراچی)، نورجہاں (کراچی)، ارشد (کراچی)، سائرہ (کراچی)، اقرا احمد (کراچی)، نمیرہ عبدالغفور (کراچی)، علینہ کنول (کراچی)، صوبیہ عیسیٰ (کراچی)، زوہیب یوسف (کراچی)، اقرا علی (کراچی)، سائرہ

لیاقت (کراچی)، سویرا لیاقت (کراچی)، صدف حمید (کراچی)، احسان اللہ (کراچی)، حلیمہ ولی محمد (کراچی)، مسکان (کراچی)، محمد بلال (کراچی)، اسامہ (کراچی)، سیما (کراچی)، صائمہ (کراچی)، حمزہ خلیل (کراچی) وقاص علی (حیدرآباد)، عبداللہ ہارون (حیدرآباد)، ولید احمد (حیدرآباد)، سبحان خان (حیدرآباد)، احسان اکبر (حیدرآباد)، محسن ولید (حیدرآباد)، معین الدین (حیدرآباد)، اقبال شاہ (حیدرآباد)، رمیز (حیدرآباد) مارج طارق (حیدرآباد)، ابو سفیان (حیدرآباد)، حزیفہ اشرف (حیدرآباد)، عبداللہ کاکڑ (بلوچستان)، سلمان صغیر (کوئٹہ)، کبیر الدین (سکھر)، رشید اللہ (ٹنڈو آدم)، قاسم (لاڑکانہ)، صہیب رشید (گوجرانوالہ)، عریش الدین (کراچی)، علی انوار (کراچی)، کومل خالد (کراچی)، ام حبیبہ (کراچی)، عماد عزیز (کراچی)، کامل زبیر (روہڑی)، زوہیب اشفاق (کراچی)، یسریٰ جاوید (کراچی)، کامران حسن (نصیر آباد)، شماس انصاری (کراچی)، بلال نسیم (کراچی)، مریم رفیع (کراچی)، روبیل ابڑو (خیر پور)، نبیل امتیاز (کراچی)، جویریہ سعید (سکھر)، عبدالرشید مینگل (بلوچستان)، اورنگ زیب مینگل (بلوچستان)، حمزہ تحسین (کراچی)، عبدالباسط زہری (نصیر آباد)، محمد ابراہیم (ڈیرہ مراد جمالی) تنزیل الرحمٰن (کراچی)، حذیفہ رضوان اللہ (کراچی)، عبدالجبار (بلوچستان)، محمد عیان (کراچی)، ناصرہ اکرام (کراچی)، رامین طیبہ (کراچی)، ثناء اللہ میرالی (نصیر آباد)، گل حسن (نصیر آباد)، زیب علی (کراچی)، حمدیٰ سعیب (کراچی)، عثمان سعید (کراچی)، حشمت علی (بلوچستان)، شرجیل مشتاق (کراچی)، چاکر خان (کراچی)، بلال لطیف (کراچی)، نور العلمہ (کراچی)، محمد اذہان (کراچی)، عمار اقبال (شارجہ)، محمد ابراہیم خان (کوٹری)، کومل فاطمہ اللہ بخش (کراچی)، علی منور (لاہور)، عارفہ شیخ (حیدر آباد)، یحییٰ سیف اللہ (کراچی)، حسن شفیق (کراچی)، علی شیر (کراچی)، محمد مصطفیٰ نور محمد فیصل (کراچی)، مرزا حمزہ بیگ (حیدرآباد)، لبیہ شفیق (کراچی)، توفیق الرحمٰن شفیق (کراچی)، ثمینہ (کراچی)، ایلا اسلم (کراچی)، کلثوم اسلم (کراچی)، فہمیدہ (کراچی)، ثمینہ (کراچی)، رحیم ولی محمد (کراچی)، کرن (کراچی)، سیف اللہ (کراچی)، نور السحر (کراچی)، اقصیٰ سحر (کراچی)، محمد عمر (کراچی)، محمد عثمان (کراچی)

دھرتی ماں کا انسان سے خطاب

عمران نرمی

میں بچھائی گئی ہوں تمہارے لیے
اور سجائی گئی ہوں تمہارے لیے
میرے بچو سدا مسکراتے رہو
میری گودی میں پینگیں بڑھاتے رہو
گنگناتے رہو لہلہاتے رہو
میرے دریا سمندر تمہارے لیے
سارے باہر اور اندر تمہارے لیے
میری فصلوں کے رنگ
اور سب ذائقے ہیں تمہارے لیے
میری سب داستانیں یہ سب واقعے ہیں تمہارے لیے
ان پہاڑوں کی چھاؤں
حسین پیڑ پودے
یہ موسم یہ برکھا
ہوائیں گھٹائیں
اور پاتال تک میں چھپی سب غذائیں
تمہارے لیے

میں نے کیا کیا کیا ہے تمہارے لیے
اور تم نے مرے ساتھ کیا کیا کیا
میری نس نس سے میرا لہو تک پیا
کارخانوں کے کالے دھوئیں میں چھپایا مجھے
میں نے خوشیاں دیں تم نے رلایا مجھے
میرے پیڑوں پہ آرے چلائے گئے
اور سمندر میں فضلے بہائے گئے
کیوں پرندوں کو پنجروں میں ڈالا گیا
کیوں مرے منظروں کو ہے کالا کیا
تم نے بارود سے کیوں اڑایا مجھے
اپنے ہاتھوں سے تم نے جلایا مجھے
میرے اوزون میں چھید کیوں کر دیے
سارے افشا مرے بھید کیوں کر دیے
میں نے کیا کیا کیا ہے تمہارے لیے
اور تم نے مرے ساتھ کیا کیا کیا
میری نس نس سے میرا لہو تک پیا

مشکل الفاظ کے معانی پینگیں: جھولے برکھا: بارش

کوشش جاری رکھیں

تحریر	قلمکار کا نام	کیفیت
موبائل کے فوائد	س۔ح۔س	مزید محنت کی ضرورت
میری ٹیچر	س۔ف۔ت	عمومی خیال
ہمت کرے انساں تو	۔۔۔	نئے خیال کی کمی
کمپیوٹر	ز۔ز	عمومی خیال
علامہ اقبال	م۔ط	مزید محنت کی ضرورت
سن لوائے کا فرو	ح۔ط	مزید محنت کی ضرورت
نادان کہیں کا	خ۔ص	ربط نہیں ہے
فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ	ش۔ا	مزید محنت کی ضرورت
مجھے شیطان کے حوالے نہ کیجیے	آ۔ع	بے جا نصیحت
خواب سے حقیقت تک	س۔ع	اختتام خواب پر
خرگوش اور نتیجہ	خ۔ن۔ص	عمومی آئیڈیا
خدمت ہے یا شوق پورا کرنا	م۔ح۔م	عمومی خیال
خدا کی تلاش	ک۔ص	غیر مناسب
بچپن کا غم	م۔ح۔م	مزید محنت کی ضرورت
حیات اقبال	ش۔ع۔ح	مزید محنت کی ضرورت
امتحان زندگی کا	ب۔ہ	مزید محنت کی ضرورت
اردو سے انگریزی (ترجمہ)	خ۔ح۔م	شائع شدہ
کرشمہ قدرت	خ۔ح۔م	مزید محنت کی ضرورت
خواب حقیقت بن گیا	ر۔ن	عمومی کہانی
شیخ صاحب کی باتیں	س۔ف۔ت	مقصد واضح نہیں
اللہ کارساز ہے	ا۔ع	مزید محنت کی ضرورت
لمبی ناک والا	م۔ع۔ع۔ر	شائع شدہ
گیسٹ ہاؤس کا راز	ہ۔ع	غیر دلچسپ
برسات	س	انتخاب

آئیڈیا برا نہیں

سمیرا امیر

اگر آپ اپنے آئیڈیے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے تو یہ تحریر ضرور پڑھیں

"میرے ذہن میں ایک دھماکے دار آئیڈیا آیا ہے۔" میں نے مسہری سے چھلانگ لگا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا! اچھی بات ہے۔" دانیہ نے بیزاری سے کہا۔

"تم پوچھو گی نہیں کیا آئیڈیا ہے؟" میں حیرانی سے بولی۔

"نہیں۔" دانیہ نے مزید بیزاری دکھائی۔

"توبہ ہے تم سے تو اللہ جی بچائے، تمھارے ساتھ تو جو بھی بیٹھتا ہے اس کو اپنی جمائیاں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے، حد سے زیادہ بور شخصیت ہو......"

میں اپنی بھڑاس نکال کر حنا کے کمرے کی طرف چل دی جہاں زور و شور سے فزکس کے رٹے لگائے جا رہے تھے، میں ہنسی دباتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

"حنا!" میں خوشی میں شاید کچھ زیادہ ہی چلائی تھی یہی وجہ تھی کہ حنا کی کتاب اُچھل کر سائیڈ ٹیبل کی زینت بن گئی۔

"کیا مسئلہ ہے آہستہ نہیں بول سکتی، ایک تو پہلے ہی بم

دھاکوں کا زمانہ ہے اوپر سے تم......"

"ارے ارے میرا مقصد یہ نہیں تھا چچی میں وعدہ لے لو، میں تو صرف تمھیں اپنا آئیڈیا سنانے آئی تھی۔" میں نے وضاحت پیش کی۔

"اپنے آئیڈیے اپنے پاس رکھو، میرا کل ٹیسٹ ہے جو یاد تھا، وہ بھی تم نے بھلا دیا۔" حنا غصے سے بولی۔

"یاد نہیں، بولو جو رٹا لگایا تھا وہ بھی تم نے بھلا دیا۔ اب میرا آئیڈیا نہیں سنو گی تو یاد رکھو تو تا، مینا، کبوتر بلکہ سارے جنگلی پرندوں کی طرح بھی رٹے لگالو، یاد نہیں ہوگا؟" میں وہاں سے بھی پیر پٹختے ہوئے نکلی اور آخر میں حنا کو منہ چڑانا بھی نہ بھولی۔

ان دونوں نے تو مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ اب اگلا ہدف امی ہی بچی ہیں جن کو اپنا منصوبہ سنانا ڈانٹ کھانے کے اور نہ سنانا پیٹ میں درد کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اگر کسی کو بھی نہ بتاؤں گی تو پیٹ میں ضرور درد ہوگا۔

"امی ایک بات کہوں مانیں گی؟" میں نے مسکین سی صورت بنائی۔

"ماننے کی ہوئی تو ضرور ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" میں ڈرامائی انداز میں بولی۔ جس کے نتیجے میں امی کا زوردار تمانچہ کمر پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی امی آپ بھی ناں؟" میں نے کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی مذاق ہی کیا ہے۔" آخر وہ بھی میری ہی امی تھیں۔

"اچھا میرا آئیڈیا تو بیچ میں ہی رہ گیا پہلے وہ تو سن لیں۔" میں نے دوبارہ بات شروع کی۔

"اوہو اپنے آئیڈیے کو گولی مارو میرا آئیڈیا جل گیا ہوگا..... مطلب سالن۔" امی نے بھی منہ موڑ لیا اب کیا کروں؟

میں پریشان ہوگئی۔ باورچی خانہ میں جھانکا تو واقعی سالن جل چکا تھا اور امی غصے سے دوسرے سالن کی تیاری کر رہی تھیں۔ میں نے اپنا آئیڈیا بتانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس وقت امی کے ہاتھ میں برتن تھے اور کسی بھی وقت میرے سر پر برس سکتے تھے، میں جھرجھری لے کر ابو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ابو مطالعے میں مصروف تھے، میں نے اندر جھانکا۔

"آ جاؤ بیٹا۔" کتابوں کے درمیان سے سر نکال کر ابو نے کہا۔

"جی ابو۔" میں نے مؤدب ہو کر کہا اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کہو بیٹا! مطالعہ کرنے آئی ہو؟" ابو نے پوچھا۔

"نہیں ابو اصل میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔"

"اچھا! یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ میری نکمی بیٹی کے ذہن میں بھی کچھ آیا ہے۔"

میں نے اپنی بے عزتی پر پہلو بدلا، چونکہ ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود نہ تھا سو میں نے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''اصل میں ابو جی، میں نے سوچا ہے۔'' میں نے بات شروع کی ہی تھی کہ ابو کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی لیکن وہاں شاید مخاطب نے پیکج کر رکھا تھا۔ پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی جب باتیں ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہ آیا تو یہاں سے بھی پاؤں پٹخنے پڑے لیکن اس وقت تک امی کا موڈ قدرے بہتر ہو چکا تھا۔

''امی جی میرا منصوبہ؟'' میں نے لپک کر کہا۔

''ہاں بھئی سنا دو۔ میرے کان کھا گئی ہو۔'' امی بھی میرے اُوٹ پٹانگ آئیڈیاز سے واقف تھیں لہٰذا منھ بنا کر بولیں۔

''اصل میں امی مئی میں ذیشان بھائی کی شادی ہے۔ ابو تو ضرور جائیں گے۔ میرا ارادہ ہے اس بار میں بھی ابو کے ساتھ ایبٹ آباد جاؤں گی، پلیز امی میرا بہت دل کر رہا ہے۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

پہلے میرا ارادہ دانیہ اور حنا کے ساتھ جانے کا تھا لیکن اب میں نے اجازت کا رُخ صرف اپنی طرف موڑ لیا، اور اتفاقاً امی نے بغیر روک ٹوک کے اجازت بھی دے دی۔ پھر میں نے جو تیاری شروع کی تو ختم ہونے کو نہ آئی۔

''یہ سوٹ تو میں برات میں پہنوں گی اس کے ساتھ یہ جوتے اچھے لگیں گے، یہ پہن لوں گی۔''

میں بظاہر خود سے مخاطب تھی لیکن سنا اُن دونوں کو رہی تھی۔ اجازت تو ان کو بھی مل ہی جاتی لیکن مسئلہ ان کے امتحانات کا تھا جو کہ مئی میں تھے۔

''کل عائشہ کا فون آیا تھا کہ ہم لوگ شملہ پہاڑی اور الیاسی مسجد گھومنے جائیں گے اس لیے مجھے جلدی جانا ہوگا ویسے بھی تیاری تو مکمل ہی ہے۔'' میں امی سے مخاطب ہوئی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب تمھارے ابو جائیں گے تو ہی جاؤ گی۔'' امی نے بمشکل جمائی روکی اور تکیہ درست کر کے وہیں لیٹ گئیں۔

''ہم پٹاخے بھی پھوڑیں گے۔'' میں نے مڑ کر حنا کو کہا لیکن پٹاخے پھوڑنے سے پہلے ہی میرے سر پر اتنا بڑا بم پھٹ جائے گا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ابو نے اچانک ہی اپنا سفری بستہ بند کیا اور آفس کے کام سے اسلام آباد سے براہ راست ہی شادی میں ایبٹ آباد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ سو ابو نے مجھے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور معذرت کرتے ہوئے سامانِ سفر اُٹھا کر چل دیے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' میں تاسف سے قالین پر ہی بیٹھ گئی۔

''ایک بات بتاؤں حرا؟'' دانیہ میرے پاس بیٹھتے

ہوئے بولی۔ میں خاموش رہی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اب وہ میرا مذاق اُڑائے گی کچھ وقفے کے بعد دانیہ خود ہی بول پڑی۔

”تم نے کبھی اپنے ارادے اپنے منصوبے میں اللہ کی مرضی کو شامل کیا ہے۔“ دانیہ نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نہ سمجھتے ہوئی بولی۔

”تمھیں پتہ ہے ایک مرتبہ آپؐ سے کسی نے تین سوال پوچھے تو آپؐ نے فرمایا: ”میں اس کا جواب کل دوں گا، یعنی کل اللہ کی وحی نازل ہوگی تو اس کے ذریعے جواب دوں گا لیکن آپؐ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے تو پتا ہے کیا ہوا؟ آپؐ پر کافی دن تک وحی نازل نہ ہوئی۔“ دانیہ نے میری طرف دیکھا۔

اور میں سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن دل میں پختہ ارادہ کر رہی تھی کہ اب میں ہر کام میں ضرور ان شاء اللہ کہوں گی۔

ان شاء اللہ!

☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

مَسہری: پلنگ	جُھرجُھری: کپکپاہٹ
مؤدب: ادب سے	شملہ پہاڑی: ایک جگہ کا نام
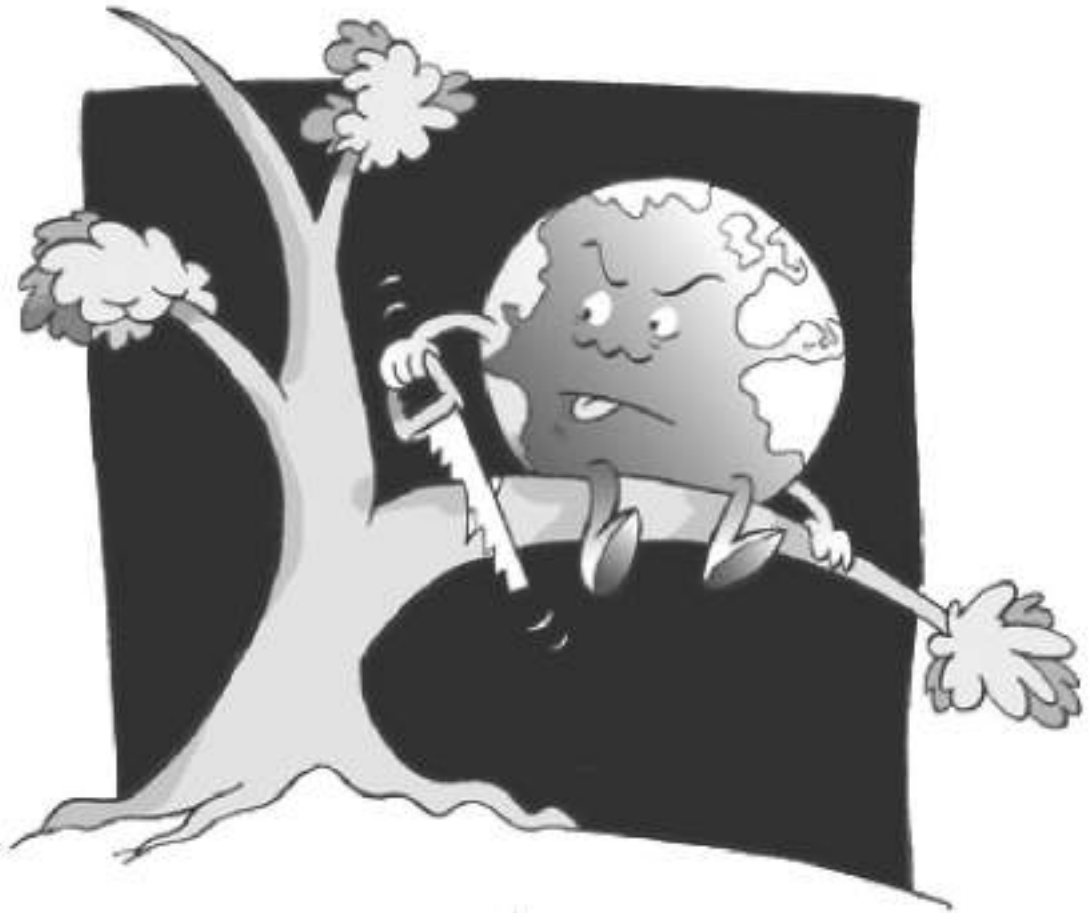
بادل چیتا

بادل چیتا (Clouded Leopard) جنوب مشرق ایشیائی ممالک کے جنگلات میں رہتا ہے۔ درختوں پر رہنے والا یہ چیتا بڑے پرندوں عقاب، اُلّو اور شاہین وغیرہ کا بھی شکار کرتا ہے۔ یہ ۱۶ سے ۳۰ کلو تک وزنی ہو سکتا ہے جو اس کی نوع کے دیگر نمائندوں میں سب سے کم ہے۔ عالمی محکمہ جنگلی حیات نے اسے ان جانوروں کی فہرست میں شامل کیا ہے جو اب تیزی سے ختم ہونے کے قریب ہیں۔ یہ ممالیہ دن میں ۱۴ گھنٹے سو کر گزارتا ہے۔ اکثر رات کے وقت شکار کے لیے نکلتا ہے۔

ظفر شمیم

مالیو مرغی

برادر اسلامی ملک انڈونیشیا کی یہ دل چسپ مرغی مالیو MALEO ہے۔ ۱۵۰۰ گرام وزنی یہ مرغی ۵۵ سینٹی میٹر تک ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک طرح کی آبی مرغی ہے جو تازہ پانیوں کے ذخائر کے آس پاس ملتی ہیں۔ ان کی تعداد کا تخمینہ ۵ سے ۱۰ ہزار تک لگایا گیا ہے۔ اگر نر یا مادہ دونوں میں سے کوئی ایک پہلے چل بسے تو دوسرا ساری زندگی یونہی گزار دیتا ہے۔ فطرت کا یہ نرالا انداز بہت سے دیگر پرندوں میں بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

ستین جو آستان

محمد مصطفیٰ سولنگی

سکھر کے قریب دریائے سندھ کے کنارے کئی ایسے تاریخی مقامات ہیں جو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی اپنا رشتہ حال سے جوڑے ہوئے ہیں۔ان تاریخی مقامات میں 'ستین جو آستان' بھی ایک ہے۔

جزیرہ بکھر کے جنوب ...... مشرقی کونے پر ایک بلند پہاڑی موجود ہے، جس پر مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور میں بکھر کے حاکم میر ابوالقاسم نمکین کا خاندانی قبرستان موجود ہے۔اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے یہ چھوٹی سی پہاڑی بہت دلکش اور بے مثل ہے۔اس پہاڑی پر قبروں کی ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔تقریباً ایک سو قبریں موجود ہیں جن پر اکبری دور میں مروج فارسی رسم الخط میں کتبے لکھے ہوئے ہیں۔

یہ مقام ان کتبوں کی تاریخی حیثیت یا مدفون خاندان کی حاکمانہ حیثیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایک بند کمرے کی وجہ سے مشہور ہے۔لوگ اس کمرے کو 'ستین جو آستان' یا 'ستین جو تھان' کہتے ہیں۔اس کمرے کے متعلق کئی روایات اور حکایات مشہور ہیں۔

نامور عالم اور محقق پیر حسام الدین راشدی نے اپنی کتاب 'تذکرہ امیر خانی' میں لکھا ہے کہ

''اس پہاڑی پر 'ستین جو آستان' موجود ہے۔اس کو فارسی زبان میں 'ستیاںٔ' کہا گیا ہے، جس کے معنی غالباً سات سہیلیاں ہیں۔''

راشدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ''اس جگہ کو سات خدا رسیدہ سہیلیوں کی رہائش کی وجہ سے بڑا متبرک سمجھا

جاتا ہے۔ ''خیر پور ریاست کے نامور حکیم اور تاریخ دان حکیم امیر علی شاہ فتح پوری لکھتے ہیں کہ ''غزنوی دور میں جب روہڑی پر حملہ کیا گیا تو اس پہاڑی پر سات بزرگ رہتے تھے۔ جب یہ سات بزرگ وہاں سے چلے گئے تو مقامی لوگوں نے تبرک کے طور پر اس جگہ کو مقدس سمجھا اور اس کا نام ''ستین جو آستان'' رکھا یعنی سات لوگوں کے رہنے کی جگہ۔

اس پہاڑی پر قبرستان بنانے اور حجرے کی تعمیر کا کام میر ابوالقاسم نمکین نے کروایا تھا۔

لیوان کے درمیان میں ایک بڑا چبوترہ موجود ہے، جس میں دس قبریں موجود ہیں۔ ان میں سے پانچویں قبر ابوالقاسم نمکین کی ہے۔ ان کی پتھریلی قبر پر دونوں اطراف سے قرآن پاک کی آیات اور مشائخ کے اقوال عربی زبان میں کندہ ہیں۔

اس قبرستان میں موجود اکثر قبریں پتھر سے بنی ہوئی ہیں۔ یہ وہ ہی پتھر ہے جو مکلی اور چوکنڈی کے قبرستان میں موجود قبروں میں استعمال ہوا ہے۔ ان قبروں پر جو کتبے لکھے گئے ہیں، ان کے متعلق مولوی محمد شفیع مرحوم اپنی کتاب ''ضادید سندھ'' میں لکھتے ہیں کہ یہ کتبے ۱۳۰۱ ہجری یعنی ۱۸۸۴ء کے ہیں۔ یہ کتبے نفیس نستعلیق میں لکھے گئے ہیں۔

''ستین جو آستان'' کی تاریخی حیثیت ہمیشہ برقرار رہے گی کیوں کہ یہ آثار سکھر اور روہڑی کی صدیوں کی تاریخ کی ایک اہم علامت ہے۔

یہ بھی دنیا ہے

طویل ترین ساحل

سمندر کا نام سن کر ہمارے ذہن میں بہت سارا پانی جمع ہو جاتا ہے۔کینیڈا کا ایک سمندر اپنے پانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کنگری دار ساحل کی وجہ سے مشہور ہے۔اگر اس کو ہموار کر دیا جائے تو دنیا کے رقبہ سے چھ گنا زیادہ پر پھیل جائے گا۔

سب سے بڑا جزیرہ

پانی میں گھرے ہوئے خشک ٹکڑے دنیا میں بہت سے موجود ہیں۔کراچی میں ایک ایسے ٹکڑے کو ہم منوڑا کے نام سے جانتے ہیں۔دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔۶۰ ملین کی آبادی رکھنے والا مشہور جزیرہ برطانیہ گرین لینڈ کے مقابلہ میں چھ گنا چھوٹا ہے۔مگر گرین لینڈ جزیرے میں صرف ۵۰ ہزار انسان آباد ہیں۔اس کا مطلب گرین لینڈ میں بسنے والوں کے کمرے برطانیہ کے رہائشیوں کے کمروں سے ۱۰,۰۰۰ گنا زیادہ بڑے ہیں۔

گمان کی حقیقت

نسرین لئیق

آج بھی وہ شخص گلی ختم ہوتے ہی اسکول کی طرف یہاں مڑنے والی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ یاسمین نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اسے طنزاً مسکراتے پایا جیسے کہہ رہا ہو: ''اب تو تمھیں میرے پاس آنا ہی پڑے گا۔'' اغوا، قتل اور اغوا برائے تاوان کے بے شمار شہر میں ہونے والے واقعات کی خبریں اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

اس کو تذبذب میں دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ یاسمین نے دوسری طرف جانے والی گلی میں دوڑ لگا دی۔ وہ سرپٹ دوڑے جا رہی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ بھی تو پیچھے دوڑ نہیں لگا رہا۔ صبح کے وقت گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ ایسے میں تو اس شخص کا کام بہت آسان تھا۔ بڑی مشکل سے گلی

ختم ہوئی اور وہ سڑک پر نکل آئی۔ یہاں سے بھی اسکول کی طرف راستہ جاتا تھا جو زیادہ لمبا تھا۔ اس شخص کی دال یہاں نہیں گل سکتی تھی کیونکہ یہاں کافی دکانیں وغیرہ تھیں اور لوگوں کی چہل پہل تھی۔ اللہ اللہ کرکے اسکول کا گیٹ نظر آیا اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ خیریت سے اسکول پہنچ گئی۔

آج اس کے ساتھ اسکول جانے والی سہیلی 'بینا' کی طبیعت خراب تھی اسی وجہ سے اسے اکیلے اسکول آنا پڑا۔ یہ دوسرا یا تیسرا موقع تھا کہ وہ اسکول کے قریب سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا ہوتا اور یاسمین جب بھی ڈرتے ہوئے اس پر نگاہ ڈالتی وہ خطرناک آدمی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا ہوتا جیسے کہہ رہا ہو ''آخر کب تک تم مجھ سے بچو گی۔'' اگر بینا ساتھ ہوتی تو وہ تیز تیز چلتی اس کے سامنے سے گزر جاتی۔ چھٹی کے وقت تو لڑکیوں کا ایک ہجوم ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ شخص صرف صبح کے سناٹے میں ہی کھڑا ہوتا تھا۔

یاسمین گھر آکے بھی بہت پریشان رہتی۔ وہ یہ بات اپنے کسی چھوٹے یا بڑے بہن بھائی کو بھی نہیں بتا سکی تھی۔ امی کو بتانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا وہ تو دن بھر گھر کے کام میں لگی رہتیں تھیں۔ دوسرے اس معاملے میں یاسمین بہت خوف زدہ تھی کچھ اس لیے بھی یہ بات کسی کو نہیں بتا سکی تھی کہ اس نے خود ہی یہ فرض کرلیا تھا کہ کوئی شخص بھی اس کے مسئلے کو حل نہیں کرسکے گا۔

پھر وہ شام کو کھیل کود میں اس آدمی کو بھول جاتی۔ مگر صبح ہوتے ہی اسے اسکول جانے کے خیال سے جھرجھری سی آنے لگتی اور وہ دل میں بے زاری محسوس کرتی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی تو اس کے ابا نے آواز دی۔

''بیٹا یاسمین اب اُٹھ جاؤ، تمھیں اسکول جانے میں دیر ہوجائے گی اور نماز کا وقت بھی نکل جائے گا۔''

اچھا ابا، اس نے جواب دیا پھر سر جھٹک کر فوراً بستر چھوڑ دیا۔ نماز پڑھ کر اسکول کی تیاری کرنے لگی۔ آج بینا اس کے ساتھ تھی۔ دونوں اسی راستے سے اسکول گئیں مگر آج وہ شخص وہاں نہیں تھا شاید بینا کو ساتھ دیکھ کر غائب ہوگیا۔ ''آخر دو لڑکیوں کو ایک ساتھ اغوا کرنا کوئی آسان بات تو نہیں ہوتی۔'' اس نے دل میں سوچا۔

اسی طرح مہینوں گزر گئے۔ ایک دن وہ باہر کھیلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس کی بڑی بہن دروازہ کھولنے گئیں، ساتھ میں وہ بھی تھی۔ اس کی جو نظر اٹھی تو سامنے وہی شخص کھڑا تھا اس کے آگے

کھڑی بڑی بہن سے مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ آدمی پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک آ گیا تھا۔ اس نے بے ہوش ہوتے ہوئے الفاظ سنے وہ کہہ رہا تھا: ''میں آپ کے والد کا دوست ہوں مجھے پتا چلا کہ وہ قریب ہی رہتے ہیں، آپ کی بہن کی شکل آپ کے والد سے بہت ملتی ہے جب بھی میں آپ کے والد کے بارے میں پوچھنے کے لیے اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتا ہوں، یہ راستہ بدل کر دوسری گلی میں مڑ جاتی ہے۔ بڑی مشکل سے پتا پوچھتا ہوا آپ کے گھر تک پہنچا ہوں۔''

☆......☆

شیخ سعدی

شیخ سعدی کا حقیقی نام مشرف الدین اور تخلص سعدی تھا۔ آپ ۶۰۶ھ میں ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت کی وجہ سے آپ کو شیرازی کہا جاتا ہے۔ کم عمری ہی میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے شیراز کے علما سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بغداد جا کر ابوالفرج عبدالرحمٰن جوزی سے تعلیم پائی۔

شیخ سعدی کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ آپ نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیر و سیاحت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، فلسطین، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ کے علاقے دیکھے۔ سیاحت کے دوران چودہ (۱۴) حج کیے اور کئی جنگوں میں بھی شرکت کی۔ شیخ سعدی طویل عرصہ سے سیاحت کے بعد ۶۶۵ھ میں واپس شیراز آ گئے اور باقی عمر ایک خانقاہ میں گزاری۔ آپ نے ۶۹۱ھ میں اسی خانقاہ میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ آپ کی تصانیف کی کثیر تعداد نظم و نثر میں ہیں، جن میں گلستان، بوستان کو آفاقی شہرت حاصل ہے۔ دونوں کتب فارسی زبان و ادب کا شاہکار تصور کی جاتی ہیں۔ شیخ سعدی نے مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت کے بعد اپنے بیش بہا تجربات اور مشاہدات کو مختصر حکایات کی صورت میں لکھ کر محفوظ کر دیا۔ آپ کی ان حکایات میں بڑے مضامین کو مختصر الفاظ میں لکھ کر اس خوبصورتی سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے کہ اس خوبی کا مقابلہ کسی زبان کا کوئی ادیب نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان حکایات کی اہمیت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی۔ آپ کی کتاب ''گلستان'' کی طرز پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر کوئی کتاب اس کی ہم پلہ ثابت نہ ہو سکی۔

مرسلہ: محمد شاہد حفیظ۔ میلسی

قطعات

ضیاء الحسن ضیاؔ

سوچ کر بولو

ترازو ہے نہ باٹ ہے پاس میرے
تو پھر بات کو کس طرح اپنی تولوں
بہت دیر سوچا تو آیا سمجھ میں
یہی اب ہے بہتر کہ میں کچھ نہ بولوں

☆......☆

پیٹو

میں پیٹو کے بارے میں اب کیا بتاؤں
بہت کھانا کھانے نے بزدل بنایا
کوئی کھیل اب کھیل سکتا نہیں میں
موٹاپے نے اسکو ٹھکانے لگایا

☆......☆

ہماری آپا

نورین ایمان

آپا تو آپ کی بھی ہوں گی لیکن ہماری آپا کی بات ہی اور ہے...... ملیے ہماری آپا سے

”آپا کیا ’گوند‘ زمین کے اندر اُگتا ہے؟“ اصغر بھیا نے معصومیت سے پوچھا۔

”ارے تمھارا دماغ خراب ہے کیا......؟“ آپا نے بھیا کو گھورا۔

”پاگل! ’گوند‘ زمین میں نہیں اُگتا...... اس کی پیپیاں ہمیشہ درختوں پر لگتی ہیں۔“ گیارہ سالہ فرح آپا کا عقلمندانہ جواب پا کر ہم چاروں مطمئن ہو گئے۔

فرح آپا بڑی اور باقی ہم چار بہن بھائی چھوٹے...... ماہ دولت کا نمبر آخری ہے۔ ہم چاروں بہن بھائی، ”بڑی آپا“ یعنی فرح آپا کی شروع سے ہی پیروی کرتے آ رہے ہیں۔

بچپن میں تو اس بات پر زیادہ ہی عمل ہوتا تھا اور پھر

جب کام غلط ہوجاتا یا کوئی گڑبڑ ہوجاتی تو ہم چاروں کسی نہ کسی طرح کھسک جاتے...... لیکن بے چاری آپا امی جان کے ہاتھوں سے نہ بچ پاتیں...... آخر وہ بڑی جو تھیں۔ بچپن سے لے کر ان کی شادی تک یہی ہوتا رہا۔

ایک بار ابو جان کی دکان پر (جو گھر کے ساتھ ہی موجود ہے) ایک بے کس اور معذور (اس کے بازو نہیں تھے) فقیر آیا...... ابو جان نے کچھ پیسے اس کے تھیلے میں ڈال دیے۔

جب اس فقیر نے ابو جان کے پاس ہم پانچوں کو لائن میں بیٹھا دیکھا تو سمجھ گیا کہ ہم انھیں (ابا حضور) کے پھول اور کلیاں ہیں تو فقیر ہمارے قریب آیا اور ڈھیروں دعائیں دینے لگا......

"اللہ سوہنیا انھاں بچے بچیاں نوں کامیابی دیویں تے انھاں دا بیڑا پار لاویں۔" فقیر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا...... خوش قسمتی کہہ لیں یا اتفاق ...... کہ اگلے روز فرح آپا کے امتحانات کا نتیجہ آنا تھا۔

آپا کے نمبرز پہلے کی نسبت کافی اچھے آئے۔ شام کو آپا بولیں: "تم لوگ جانتے ہو کہ میرا رزلٹ کیوں اچھا آیا؟"

"نہیں......" ہم چاروں ایک ساتھ بولے۔

"ارے بے وقوفو! یہ اسی فقیر کی دعاؤں کا نتیجہ ہے جو میرے اتنے اچھے نمبر آئے۔"

ہم سب حیرت سے آپا کو دیکھنے لگے۔ بس پھر کیا تھا، ہم چاروں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو فقیروں کو خوش کریں گے اور دعائیں لیں گے۔ اب تو یہ ہم سب بہن بھائیوں کا معمول بن گیا کہ جب بھی کوئی فقیر گھر یا دکان کے باہر آتا تو ہم اسے امی ابو سے چوری چھپے کھانے پینے کی چیزیں دے دیتے اور بار بار کہتے بابا جی دعا کرنا میں اس سال اوّل آؤں...... آپ کو خوش کردیں گے اگر ہمارے نمبر ٹاپ پر ہوئے تو......

اب تو ہم بچوں کی وجہ سے ہٹے کٹے فقیروں کا رش بھی بڑھ گیا تھا۔ کہاں پہلے ایک دو فقیر جمعرات کے جمعرات آتے اور کہاں اب روز ہی تین چار فقیر آجاتے۔

"حیرت ہے جی...... میں روز صبح بھی دوپہر میں بھی دو، چار روٹیاں زائد پکاتی ہوں...... مرغیوں اور خرگوشوں کو ڈالنے کے لیے۔ مگر روز ہی روٹیاں غائب ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ سالن بھی صبح کا پکا دوپہر تک ختم ہوجاتا ہے۔" ایک رات کھانے کے دوران امی، ابو جان سے کہہ رہی تھیں۔

"اور میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ آٹا اب وقت سے پہلے ہی ختم ہوجاتا ہے۔" امی کی بات پر ابو جان نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

ہم چونکہ پاس بیٹھے امی، ابو دونوں کی باتیں غور سے سن

رہے تھے، تو جھٹ سے بولے۔
"امی جی آپ بھی بابا جی اور اماں جی سے دعائیں کروائیں پھر آپ کا بھی آٹا، روٹی اور سالن کبھی جلدی ختم نہیں ہوگا۔"
"کون سے بابا جی اور اماں جی؟" ہماری بات پر امی ابو دونوں حیران ہوتے ہوئے ایک ساتھ بولے۔
ہم چونکہ سب سے چھوٹے تھے عمر میں بھی، عقل میں بھی......
جب ہی چاروں، بہن بھائیوں کے گھورتے کے باوجود بھی کچھ نہ سمجھ پائے اور بڑے آرام سے ساری بات بتانے لگے کہ فرح آپا، سیمرا آپی اور دونوں بھائی فقیروں کو گھر اور دکان سے چیزیں دے دے کر دعائیں کرواتے ہیں۔
ابھی ہماری بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ چاروں بہن بھائیوں کی کلاس شروع ہوگئی......امی، ابو نے چاروں کو رات میں اچھی خاصی تھیوری (ڈانٹ) سنائی اور انہوں نے صبح اٹھ کر ہم پر پریکٹیکل کیے یعنی مارا۔
ایسے ہی ایک بار فرح آپا کمرے میں داخل ہوئیں تو انھوں نے پورے منھ پر کوئی کریم لیپ کی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ایک ٹیوب سی پکڑی تھی۔ ہمارے پاس آتے ہی بولیں۔
"چندا تمھیں رنگ گورا کرنا ہے"......ہم تو صدا کے آپا کے مرید تھے......فوراً کہا: "جی۔"
"لیکن وعدہ کرو، امی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔" ہم نے جھٹ سے آپا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وعدہ بھی کرلیا۔
بس پھر کیا تھا...... چند منٹ میں ہی ہمارا گورا چٹا چہرہ آپا نے کریم سے لیپ دیا۔
تقریباً آدھے گھنٹے بعد آپا نے پہلے اپنی پھر ہماری کریم اتاری تو شیشے میں ہم خود کو پہچان ہی نہیں پارہے تھے۔
اچانک امی (جو بازار گئی ہوئیں تھیں) آگئیں۔ جب کمرے میں آئیں تو ہمارے چہرے حیرت سے تکنے لگیں۔
آپا ہمیں پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ امی کو کچھ نہیں بتانا۔ لہٰذا ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے ہم امی سے کہنے لگے۔
"امی جی ہم آپ کو کچھ نہیں بتائیں گے کہ ہم نے یہ کریم لگائی ہوئی ہے۔" ہماری بھنویں غائب دیکھ کر ہی امی جان سمجھ گئی تھیں، لہٰذا امی جان نے آپی کی تو جو کلاس لی سو لی مگر ہماری بھی اچھی خاصی دھلائی کر دی۔
ہماری آپا کے کام ایسے ہوتے کہ سب ہی سر پکڑ کر رہ جاتے۔ بعض اوقات آپا کی وجہ سے ہمیں اسکول اور کالج میں بھی شرمندگی اُٹھانی پڑتی۔
مطلب اگر آپا صفائی کے دوران اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹ رہی ہوتیں تو وہاں موجود کسی کے بھی

بیگ میں چلی جاتیں...... اکثر کلاس میں کاپی پنسل نکالتے ہوئے کبھی ہاتھ میں چمچ آرہا ہوتا تو کبھی چھری......

کبھی کبھی تو حد ہو جاتی "کمر بند" بیگ سے حاضر ہوتا دکھائی دیتا۔ اوّل تو آپا سست بہت تھیں مگر کسی مہمان کے آنے کی اطلاع مل جاتی تو آپا کے ہاتھوں کے ساتھ پاؤں بھی کام کرنے لگتے۔ مثلاً اگر آپا ہاتھوں سے جھاڑ پونچھ کررہی ہیں تو پاؤں راستے میں آنے والی چیزوں کو ٹھوکر لگاتی جاتیں۔ کوئی چیز ٹھوکر لگنے سے مسہری کے نیچے جارہی ہوتی تو کوئی الماری کے پیچھے۔

شادی سے پہلے تک آپا کی یہی صورتحال رہی مگر اب شادی کے سال بعد ہی آپا کی ہم کو نصیحتیں شروع ہوگئی ہیں۔

"عقل سے کام کرتے ہیں، سستی نہیں کرنی چاہیے، ایسے کرنا چاہیے، یہ نہیں کرتے، وہ نہیں کرتے۔"

اب جب وہ ہمیں سمجھاتی ہیں تو ہم سب حیرت سے آپا کو دیکھتے ہیں کہ کیا یہ واقعی ہماری آپا ہیں......

☆......☆
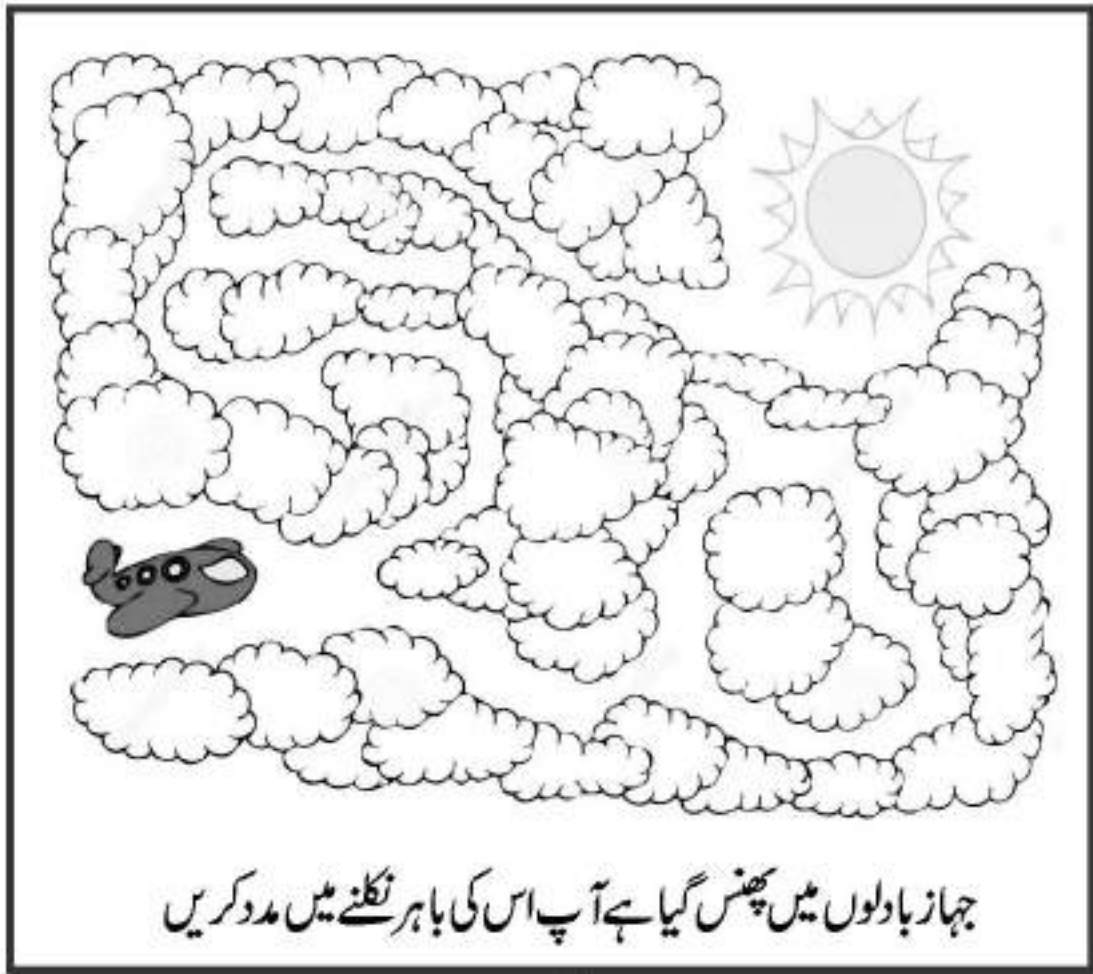
جہاز بادلوں میں پھنس گیا ہے آپ اس کی باہر نکلنے میں مدد کریں

آپ کی نِگارشات

"آپ کی نگارشات" میں حصہ لینے والے اپنی کہانیاں، مضامین، نظمیں ہمیں روانہ کرسکتے ہیں۔ ضروری نوک پلک کے بعد آپ کی نظم/تحریر کو شائع کیا جائے گا۔

☆تحریر پانچویں جماعت تک کے طلبہ بھیج سکتے ہیں۔

☆نظم بھیجنے کے لیے عمر یا جماعت کی کوئی قید نہیں۔

☆اپنی نگارشات کے ساتھ اپنی ایک عدد تصویر بھیجیں جسے تحریر/نظم کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ارسلان اللہ خان

ان کے در پر ہو ہماری حاضری
اے خدایا جلد آئے وہ گھڑی
خاک پر سوئے ہیں محبوبِ خدا
اللہ اللہ مصطفیٰ کی عاجزی
ارسلاں جو ہیں غلامانِ نبی
ان سے سیکھو تم مزاجِ بندگی

☆......☆

سردی آئی

شارق ابرار فجر

سردی آئی میرے بھائی
کمبل اوڑھو اور رضائی
بچو ہوا سے موزے پہنو
خود کو بھائی گرم ہی رکھو
پانی سے اب ڈر لگتا ہے
سردی سے اب ڈر لگتا ہے
قدرت کا ہے خوب نظام
موسم اس کا ہے انعام

☆......☆

تھا جو جماعت میں سناٹا
عاصم نے سناٹا توڑا
ہنسا وہ زور سے ہاہاہا
سر نے عاصم کو پھر پکڑا
پیٹنے لگا پھر عادل اس کو
شرم سے ہو گیا پانی پھر تو
توبہ توبہ زور سے بولا
پھر نہ اس نے منھ کو کھولا

☆......☆

ماں
محمد شارق شجر

میں کام اچھے ہر دم کروں گا
ماں کا ہمیشہ میں دم بھروں گا
نقشِ قدم پہ اس کے چلوں گا
اپنے رب کا بندہ بنوں گا
عالم بنوں گا، خدمت کروں گا
اپنے بڑوں کی عزت کروں گا

☆......☆

نظامِ دنیا
بنتِ محسن

پیدا کی ہے زمیں اور یہ آسماں
دور تک ہے چمکتی ہوئی کہکشاں
ہے عطا تیری پانی ہوا جھیل سب
کیوں کہ خالق ہے تو اور تو سب کا رب
بیج سے تو نے کتنے اگائے شجر
کس قدر اس پہ حیران ہے ہر بشر
نعمتیں تو نے دی ہیں ہمیں بے بہا
کس طرح شکر تیرا کریں اے خدا
بنتِ محسن کی مقبول ہو اب دعا
ہر مصیبت سے یا رب تو اس کو بچا

☆......☆

ہنسنا بری بات
محمد عمر بن عبدالرشید

عادل کو جب سر نے مارا
رویا پھر تو وہ بہت چارا

ارلی کرلی

محمد سارم ہاشمی

ارلی کرلی دو تھے بھائی
اک دن ان کی خالہ آئی
دونوں موقع پا کر بولے
آنکھوں کو مٹکا کر بولے
خالہ کے گھر جائیں گے
کیک اور انڈے کھائیں گے
سن کر امی ان کی امی بولیں
تم ہو دونوں ارلی کرلی
خالہ جان کو تنگ نہ کرنا
جا کر ان سے جنگ نہ کرنا
جب وہ خالہ کے گھر پہنچے
دونوں صوفے پر جا بیٹھے
اتنے میں اک ننھی لڑکی
تھال میں کیک اور انڈے لائی
دیکھ کے وہ سب بھول گئے تھے
ماں کا کہنا بھول گئے تھے
ٹھوکر سے گلدان بھی توڑا
چائے کا سامان بھی توڑا
خالہ طیش میں آکر بولی
تم ہو دونوں ارلی کرلی
کیک کے بدلے ڈنڈے کھاؤ
بے صبری کا پھل یہ پاؤ

☆......☆

دعا

نامعلوم

میں تیری بڑائی لکھوں میرے مالک
سیاہی کے بدلے سمندر تو دے دے
تجلی نظر آئے تیری ہر اک سو
الٰہی تو آنکھوں کو قوت وہ دے دے
ترے دین پر اپنی جاں میں لٹا دوں
تو قسمت میں میری شہادت وہ دے دے
مجھے اپنے نزدیک کر میرے مولا
رہے پھر تمنا کسی کو نہ مجھ سے

☆......☆

ہمارا کیا قصور

جی ہاں ساتھیو! اگر آپ کی تحریر قابل اشاعت نہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟
کبھی آپ نے اپنی غلطیوں کے بارے میں سوچا ہے کہ کہیں آپ کی تحریر......

- نقل شدہ تو نہیں
- بہت زیادہ طویل تو نہیں
- عام موضوع پر لکھی گئی تحریر تو نہیں
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں مختلف سلسلوں کے لیے تو نہیں لکھی گئیں۔
- کہیں پنسل سے اور خراب لکھائی میں تو نہیں۔
- کہیں نظم بغیر اصلاح کے تو ارسال نہیں کر دی۔

یا

اگر نہیں تو پھر غلطی ہماری ہے

اور ہاں......ایک دو باتیں اور......

تحریر پر اپنا نام، مکمل پتا اور تاریخ ضرور لکھیں

یاد رکھیں: بڑا ادیب بننے کے لیے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے

صفحے کے ایک طرف خوشخط اور سطر چھوڑ کر تحریر کریں

تحریر بھیجنے کے بعد دوبارہ منگوانے کی ضد نہ کریں، بلکہ فوٹو اسٹیٹ کروا کر پہلے رکھ لیں

جگر

پروفیسر حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

جگر ہمارے جسم کا ایسا کیمیکل پروسسنگ پلانٹ یا کیمیکل فیکٹری ہے جو ہماری زندگی میں وہ کام کرتا ہے جس کو کرنے کے لیے انسان کو کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی کیمیکل فیکٹری کی ضرورت ہوگی۔

یہ بڑا اہم، قوی اور لچک دار عضو ہے، اس میں مرمت اور اصلاح کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کی یہ خوبی ہمیں نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ جگر کا بڑا حصہ کاٹ دیا جائے تب بھی یہ معمول کے مطابق کام کرتا رہتا ہے اور کچھ عرصے میں واپس اپنی اصل حالت میں آجاتا ہے۔

جگر کی اہمیت کے پیش نظر قدرت نے اس کو ہمارے جسم میں بڑی محفوظ جگہ عطا کی ہے۔ جسم کے دیگر اعضائے رئیسہ دل و دماغ سے جسامت میں بڑا ہے۔ اس کا وزن ڈیڑھ کلو کے لگ بھگ ہوتا ہے اور یہ ہمارے جسم میں دائیں جانب پسلیوں کے نیچے واقع ہے۔ بالائی جانب اس کے دو فصص (Lobelu) نظر آتے ہیں۔ پہلا حصہ پوری طرح دائیں جانب ہوتا ہے، جبکہ دوسرا حصہ بائیں جانب معدے کے

اوپر تک آجاتا ہے۔ عورتوں کا جگر قدرے چھوٹا اوپر کی طرف پھیپھڑوں سے ملحق ہوتا ہے۔ تندرست شخص کے جگر کو پسلیوں سے نیچے نہیں آنا چاہیے۔ جگر کی درست کارکردگی ہماری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ ہمیں زندہ رکھنے کے لیے پانچ سو سے زیادہ حیات آفریں خدمات انجام دیتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بنیادی خدمت بھی رُک جائے تو انسان کو اپنی وصیت تیار کر لینی چاہیے۔

جگر کے مختلف کام ہیں۔ یہ اپنے اندر حیاتین کا ذخیرہ کر لیتا ہے۔ اگر آپ ایک دو سال تک حیاتین الف استعمال نہ کریں تب بھی آپ کو اس کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ یہ حیاتین الف کے علاوہ حیاتین 'ب' 'ڈ' اور 'ک' بھی جمع کر لیتا ہے۔ اکثر آپ کے چوٹ لگ جاتی ہے اور خون بہنے لگتا ہے مگر جلد ہی خون جم جاتا ہے، پھر اس جگہ پر کھرنڈ آجاتا ہے، اس طرح خون ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے اور جسم میں داخل ہونے والے کھربوں جراثیم کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ وہ کیمیائی مادہ جو بوقت ضرورت خون کے اندر جمنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، خون کے میں تیار حالت میں موجود نہیں ہوتا، اس کے مختلف اجزاء خون میں الگ الگ تیرتے رہتے ہیں، ان میں ایک جز وٹامن 'ک' ہر وقت خون میں شامل ہوتا رہتا ہے۔ جگر جسم کو زہریلے اجزا سے محفوظ رکھتا ہے، خون میں شکر کی سطح متوازن رکھتا ہے اور حیوانی شکر (گلائیکوجن) تیار کرتا ہے۔ جگر پت یا صفراء پیدا کرنے کے علاوہ کولیسٹرول بھی تیار کرتا ہے، جس میں موجود غیر ضروری اجزا کو جسم سے خارج کرتا ہے، انسان کے زندہ رہنے کے لیے ایک ہزار کے قریب اینزائم (Enzymes) (جن میں غذا کو ہضم کرنے میں مدد دینے والا اینزائم بھی شامل ہے) پیدا کرتا ہے۔ جگر روزانہ 5 سے 9 لیٹر پت یا صفراء پیدا کرتا ہے۔ یہ کڑوا سبز رنگ کا مادہ ہوتا ہے جو جگر کے نیچے ایک تھیلی (Gallbladder) میں جمع رہتا ہے۔ صفراء غذا ہضم کرنے کے عمل میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے،

خاص طور پر ایسے اجزاء جن میں چربی ہوتی ہے۔ صفراء نکل کرایک نالی کے ذریعے چھوٹی آنت میں ٹپکتا ہے، یہ آنتوں کی حرکت کو تیز کر کے غذا کو آگے سرکنے میں مدد دیتا ہے۔ یرقان میں ہماری آنتوں میں پت نہیں گرتا جس کی وجہ سے مریض کو قبض ہوجاتا ہے۔ براز کا رنگ سفید ہوجاتا ہے اور صفرا میں سخت بدبو ہوجاتی ہے۔ براز کی موجودگی میں بدبو کافی حد تک ختم ہوجاتی ہے اور آنتوں میں موجود مضر صحت بیکٹیریا ہلاک ہوجاتے ہیں۔ جب بچہ ماں کے رحم میں نمو پارہا ہوتا ہے تو جگر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت جگر خون کے سرخ خلیات تیار کرتا ہے، لیکن پیدائش کے بعد جگر اپنا کام بند کردیتا ہے۔ پھر اس کا ایک اہم کام خون خارج کرنا ہوتا ہے۔ جگر میں ہر وقت جسم میں موجود کل خون کا چوتھائی حصہ موجود رہتا ہے۔ جگر ہر منٹ میں ایک لیٹر سے زائد خون فلٹر کرتا ہے۔ گویا ایک گھنٹے میں ساٹھ لیٹر خون فلٹر ہوتا ہے۔ جگر سے آنتوں میں ورید بابی (Portal Vein) کے ذریعے غذائی اجزا مزید ہاضمہ کے عمل سے گزرتے ہوئے جگر میں پہنچتے ہیں۔ جگر کے خلیات خون میں سے غذائی اجزا کو الگ کرلیتے ہیں اور اس کو مخصوص کیمیائی ہاضمے کے عمل سے گزار کر کچھ مقدار ذخیرہ کرلیتے ہیں اور کچھ مقدار خون میں شامل کردیتے ہیں تاکہ جسم کے تمام حصوں کو غذائی اجزا مل جائیں۔

جگر خون کے اجزا کے تناسب کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ اس کے لیے یہ تلی کی مدد سے خون کے ناکارہ سرخ خلیات کو جن کی عمر چار ماہ سے زائد ہوچکی ہو، مخصوص عمل کے ذریعے سے توڑ کر اس میں سے ہیموگلوبن الگ کرلیتا ہے اور اسے بلی روبن (Bilirubin) میں تبدیل کرکے اس سے پت یا صفرا تیار کرتا ہے اور باقی غیر ضروری اجزا کو جسم سے خارج کردیتا ہے۔ یہ خون میں شکر کا تناسب برقرار رکھتا ہے۔ جگر شکر اور چربی کو لحمیات یعنی پروٹین میں تبدیل کرتا ہے۔ آنتوں سے جذب ہونے والے گلوکوز کا بڑا حصہ جگر اپنے اندر ذخیرہ کرلیتا ہے اور حسب ضرورت جسم کو توانائی کے لیے دیتا رہتا ہے۔ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو جسم میں شکر کی سطح زیادہ ہوجاتی ہے، اس وقت جگر اور انسولین کی مدد سے گلوکوز کی مقدار کم ہوجاتی ہے تو جگر حیوانی شکر کو دوبارہ گلوکوز میں تبدیل کرکے خون میں شامل کردیتا ہے۔ جب ہم محنت ومشقت کا کام کرتے ہیں تو کافی بھاری مقدار میں گلوکوز کی مسلسل ضرورت ہوتی ہے، اُس وقت جگر یہ توانائی فراہم کرتا ہے۔ دماغ کو بھی گلوکوز کی مسلسل ضرورت ہوتی ہے، اس کو بھی جگر یہ توانائی فراہم کرتا ہے۔

بھارت سے آئی ایک کتاب

شمس الرحمٰن فاروقی

شوکت پردیسی مرحوم نے زندگی کا بڑا حصہ تنگ دستی میں گزارا۔ اُنھیں اپنے کلام اور کمال کا خاطر خواہ صلہ نہ مل سکا۔ ان کے آخری برس اگرچہ مشکلات کا شکار رہے، لیکن اُنھوں نے شعر کہنے اور اردو کی خدمت سے کبھی منھ نہ موڑا۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کے صاحب زادگان نے ان کے نام نیک کو ضائع ہونے سے بچالیا ہے اور ان کے دو مجموعے شائع کیے ہیں۔ اب یہ تیسرا پیشِ نظر ہے۔ شوکت پردیسی کی ایک بڑی ان کی قدرتِ کلام تھی۔ رباعی جیسے مشکل فن سے لے کر بچوں کی نظموں تک ہر صنف پر اُنھوں نے دسترس کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ بچوں کے لیے اُنھوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں اکثر میں، میں نے یہ خوبی دیکھی کہ وہ بچوں سے بچوں ہی کی سطح پر معاملہ کرتے ہیں، ان کے بزرگ بن کر نہیں، بلکہ ساتھی اور ہم جولی بن کر۔ یہ صفت اُردو کے کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے، جنھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔

موجودہ مجموعے میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، رباعیاں بھی ہیں اور قطعات و غزلیات بھی۔ اِدھر کچھ دنوں سے رباعی کا چلن ہمارے یہاں بہت ہوگیا ہے اور قطعہ گوئی اب اکثر مشاعروں ہی کے شاعروں کا شعار بن گئی ہے۔ اول الذکر صورتِ حال اگر خوش آیند ہے تو موخر الذکر صورتِ حال افسوس کی موجب ہے۔ عباسیوں کے زمانے کی عربی شاعری میں قطعات کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ تب سے اب تک ہزار برس سے زیادہ ہو چکے ہیں، لیکن قطعات کی اہمیت برقرار ہے۔ ہمارے قریب العہد شعرا میں اختر انصاری کا نام قطعہ گوئی کے لیے مشہور تھا۔ ان سے پہلے مسعود اختر جمال نے بھی عمدہ قطعات کہے تھے۔ پردیسی صاحب کے بعض قطعات کو قطعہ نہیں، بلکہ چار نظموں کی نظم کہنا چاہیے لیکن جو درحقیقت قطعات ہیں، ان میں زبان اور احساس کی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بے ساختگی بہت ہے۔ شوکت صاحب کی غزلیں ہمارے زمانے کے بعض بہت بڑے اور مستند مغنیوں نے گائی ہیں۔ مثلاً منا ڈے، طلعت محمود، وغیرہ۔ کسی غزل گو کے لیے اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوگی۔ اس مجموعے کی اشاعت سے شوکت پردیسی کا نام بلند اور بھی بلند ہوگا۔

گھر بنانا چاہیے

فرحت طاہر

نیا گھر بننے کے دوران اُس پر کیا مشق ستم ڈھایا جاتا ہے...... پڑھیے اس تحریر میں

یہ خیال ہمارے والدین خصوصاً والد کے ذہن میں اس وقت آیا جب وقت وہ فراغت (ریٹائرمنٹ) کے قریب تھے۔ اچھے بھلے سرکاری بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ مگر ایک تو ہمارا مالی کسی رشتہ دار سے کم نہ تھا۔ جانے کیا مسئلہ تھا۔ جلتا تھا یا کام چور تھا۔ ہر وقت شکایت کہ اتنے بڑے بڑے درخت ہیں، میں پتے چن چن کر تھک جاتا ہوں۔ گھر کے کسی فرد سے ملاقات کرتا، یہ بھاشن ضرور دیتا کہ یہ تو سرکاری بنگلہ ہے۔ آپ کو چھوڑنا پڑے گا۔ میں نے تو پلاٹ لے لیا ہے۔" اس کا یہ جملہ سن کر کان پک گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ احباب کی نصیحتیں کہ میاں حج کرلیا مبارک ہو، اب گھر بھی بنالو...... یہ کوئی آبائی مکان تھوڑی ہے کہ منزل کے اوپر منزل بناتے چلے جائیں۔ سرکاری کالونی میں تو آبادی اپنی حدود میں رہتی ہے۔ اِدھر فراغت ہوئی اُدھر گھر چھوڑنے کا حکم نامہ تیار ملتا ہے۔

کہتے ہیں کہ مسلسل برسنے سے تو پتھر میں بھی سوراخ ہوجاتا ہے چنانچہ ہمارے والد محترم کا پیمانہ اس روز

چھلک کر باہر آ گیا جب ایک رشتہ دار بچی کا جملہ ان کی سماعت سے ٹکرایا: "یہ مکان آپ کا تھوڑی ہے۔" بچے کیا جانیں ذاتی اور سرکاری مکان کا فرق؟ وہ تو اپنے ابا کی زبان بول رہی تھی جو یقیناً اُنھوں نے اپنے گھر کے مقابلے میں ایسا گھر خریدنے کے مطالبے پر اس کو تسلی کے لیے دی ہوگی...... تو بس سنجیدگی سے اس محاذ پر کام شروع ہوگیا جس کی ابتدا پلاٹ کی خریداری سے ہوئی۔

بہت ہی مناسب قیمت پر کارنر پلاٹ۔ گھنے جنگل کے درمیان میں اُبھری ہوئی سطح پر (نہ جانے کے ڈی اے والوں نے پلاٹ کی کٹنگ کس طرح کی ہوگی اس مخروطی طرز کی جگہ پر؟) آب و ہوا نہایت خوشگوار! ویرانہ اتنا کہ اُلّو کو ڈھونڈیں! شاندار محلِ وقوع کے ضمن میں ہمارے ابا کے دو ہی دلائل تھے۔ ایک تو یہ کہ موجودہ رہائش کے اتنا قریب ہے کہ وہی مانوس بس اسٹاپ ہے۔ بس سے اُتریں تو ابھی شمال کی طرف کو گھر ہے بعد میں جنوب کی طرف...... ہمارے ابا کو بسوں کے سفر اور پیدل چلنے پر عبور تھا۔ اس پر امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ برابر والی پہاڑی کی چوٹی پر رینجرز گھات لگائے بیٹھی تھی کیونکہ قریب ہی ان کا مرکز تھا تو بس حفاظتی لحاظ سے بہترین ٹھہرا...... نقشے کے مطابق اس سے ملحقہ پارک اور نزدیک سرکاری آفس بھی تھا۔ ہوگا...... فی الحال تو سب کچھ گھنی جھاڑیوں کی شکل میں تھا۔

پلاٹ کی ملکیت کے بعد جب ہم اس کے سامنے مرکزی شاہراہ سے گزرتے تو رینجرز کی بندوق کی نالی دیکھ کر اپنی زمین کا اندازہ کر لیتے۔ دل باغ باغ ہو جاتا مگر وہاں رہائش کا ہنوز کوئی امکان نہیں تھا۔

اب مسئلہ تھا گھر بنانے کا۔ اس کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مترادف جوں ہی اس کی بھنک ہمارے ابا کے اس وقت کے مشیر اور صلاح کار کو ملی۔ وہ اپنے سالے (زوجہ کے بھائی) کی آرکی ٹیکچر میں سند یافتہ کا ہونے کی خبر لے کر حاضر ہوئے۔ ساتھ ہی ایک بلڈر بھی نتھی ہوگیا۔ اس ننھے سے پلاٹ پر پتا نہیں کتنے بڑے بڑے منصوبے بن گئے۔

کافی ردوکد کے بعد ایک ڈیزائن طے ہو ہی گیا۔ کاغذ پر بنے نقشے کو دیکھ کر گھر میں ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ باقی سارے نشانات تو سمجھ میں آ رہے تھے مگر یہ آخر میں پی روم کیا ہے؟ عقدہ کھلا کہ پلے روم ہے۔ سردیوں میں وہاں بلیئرڈ (اسنوکر) وغیرہ کھیلی جا سکے گی۔ پلاٹ کی ٹوپوگرافی دیکھتے ہوئے اُنھوں نے گھر کے آدھے حصے میں تہ خانہ بنایا۔ اس کے برابر میں نوکروں کا کمرہ ایک بیت الخلا کے ساتھ...... موصوف نے جہاں سے ڈیزائن اخذ کیا تھا وہاں یہ سارے لوازمات انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ پتا نہیں سوئمنگ پول کو

کس طرح نقشے سے باہر کیا ہوگا بے چارے نے۔
یہاں برف باری تو ہوتی نہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس اعتراض کا جواب یوں سامنے آیا کہ چلیں پلے (کھیل کا کمرہ) نہ سہی پرے روم (عبادت کا کمرہ) سمجھ لیں۔ اس کے لیے اتنا بڑا سا کمرہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ جاے نماز تو کہیں بھی بچھائی جاسکتی ہے۔ ہم بھی جوابی اعتراض داخل کر سکتے تھے مگر یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ یہاں اجتماع ہوسکتا ہے۔ ڈے کیئر سنٹر بنا سکتے ہیں، لائبریری وغیرہ وغیرہ۔

پلاننگ مینجمنٹ کا شعبہ تو ہم پاکستانیوں کے لیے گھر کی مرغی ہے۔ شیخ چلی تو بے چارا بس مشہور تھا۔ یہاں یہ بات بھی گوش گزار کریں کہ اس نومولود آرکی ٹیکچر کا ڈیزائن منظور ہونے پر ہمارے بہت سے قریبی رشتہ دار اور احباب جو باقاعدہ سند یافتہ انجینئر تھے خاصے عرصے ناراض رہے۔ ہمارے خیال میں ان کے تحفظات درست تھے۔

نقشہ پاس ہونے کے بعد کا مرحلہ تعمیرات کا تھا۔ ہمارے ابا جان کو فارغ ہوتے ہی ایک بامقصد مصروفیت ہاتھ آگئی۔ روز صبح ناشتے کے بعد پانی کی بوتل لے کر چھوٹے بھائی کے ساتھ پلاٹ پر تشریف لے جاتے اور مزدوروں کے ساتھ دن گزار کر مٹی میں اَٹے شام کو تشریف لاتے۔ اتنے پتھریلے علاقے میں کھدائی آسان نہ تھی۔ بنیادیں ڈالنے کے بعد بیسمنٹ میں کام شروع ہوا۔ بقول ہمارے ابا جان کے اس میں اتنا وقت اور سرمایہ لگا کہ ایک پوری منزل بن سکتی تھی۔ اللہ اللہ کر کے زمین کے اوپر کام شروع ہوا تو کچھ شکل نظر آئی۔ جس دن بس سے گزرتے ہوئے اوپری منزل کی دیوار نظر آئی ہم خوشی سے چیخ پڑے اور ہمارے برابر میں بیٹھی خاتون نے ہمیں سہم کر دیکھا۔

اس مشغولیت کی وجہ سے گھر کی فضا تبدیل ہوگئی اور ہر وقت اسی کا ذکر ہونے لگا۔ ماحول تعمیراتی کمپنی سا ہوگیا۔ اب گفتگو کے موضوع یہ تھے کہ بجری، ریت، سیمنٹ، سریا کہاں سے ملے گا؟ کیا قیمت ہے؟ شیشہ کہاں بہترین ملے گا؟ ٹائلز اور ماربلز پر بھی خاصی تحقیق ہوئی۔ گاہے بگاہے ہم سب گھر والے سائیٹ کا معائنہ کرتے اور مزدوروں کو زچ کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک دن ہم سب اسی سرگرمی کے لیے پہنچے تو مجوزہ دروازے سے داخل ہوتے ہی دو بڑی بڑی کھائیاں نظر آئیں۔ ہم تو چیخ مار کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ایک تو بیسمنٹ کی طرف جانے والا خلا تھا جہاں سیڑھیاں لگنی تھیں۔ دوسرا زیر زمین پانی ذخیرہ رکھنے کے لیے تھا۔ اتنا بڑا؟ کیا پورا واٹر بورڈ یہیں آرہا ہے؟" پورے چار واٹر ٹینکر آجائیں گے اس میں۔ بلڈر کا فخریہ جملہ ہمیں ذرا پسند نہ آیا۔ ہر معاملے میں فیاضی سے کام

لے رہے تھے۔لوہا اتنا ٹھونسا گیا کہ لگتا تھا کہ اتفاق فاؤنڈری کا سارا مال یہیں کھپانا ہے۔ اس کے مضر اثرات یہ ہوئے کہ کچن اور وارڈ روب کے جو ڈیزائن ہم نے کیٹلاگ دیکھ کر پسند کیے تھے، بجٹ آؤٹ ہونے کے باعث ادھورے رہ گئے۔

آخری کام بجلی کی فٹنگ تھا۔ فانوسوں کی خریداری پر جو بحث ہوئی ہے تو اسمبلی سیشن یاد آ گیا۔ رنگ و روغن کے بعد ہمارے منتقل ہونے کا مرحلہ تھا۔ مگر نہیں اس سے پہلے ماربلز کی گھسائی کا کام بھی تو باقی تھا۔ اس لیے ابھی شرف رہائش نہیں بخشا جا سکتا تھا۔ وجہ؟ بنیادی سہولیات کا فقدان یعنی بجلی نہیں، گیس ندارد اور پانی کے لیے تو کئی برس یعنی ۱۹۹۸ء تک انتظار کرنا تھا۔ ہنوز دلی دور است کے مصداق! (یہ انتظار اگلی صدی میں جا کر ۲۰۰۹ء میں ختم ہوا جب واٹر بورڈ کی لائن سے پانی ہمارے گھر آیا) ہاں البتہ ٹیلی فون کا چونکہ نیا ایکسچینج لگا تھا لہٰذا ڈیمانڈ نوٹ اگلے ہی دن خالی پلاٹ پر پھڑ پھڑانے لگا۔ اس سے انتظار کرنے کو کہا گیا کہ پہلے گھر کا کچھ ڈھانچہ کھڑا ہو پھر دیکھیں گے۔

گھر میں ہماری منتقلی قدرے تاخیر سے ہوئی۔ وہ ایک الگ کہانی ہے پھر کبھی سہی...... ہاں اتنا ضرور بتا دیں کہ ہم یوں تو یکم اگست کو اس گھر میں شفٹ ہو چکے تھے مگر باضابطہ طور پر اگست کی ۱۴ تاریخ کو جشن آزادی ہم نے اپنے نئے ملک...... معاف کیجیے گا گھر میں منایا۔

درمیانی وقفہ کہاں اور کیسے گزارا؟

اپنے گھر میں کیا تجربات رہے؟ آئندہ پڑھیے گا۔ ہاں مالی کا انجام بھی۔

☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

بھاشن: تقریر — کارنر: کونا

ضمن: تعلق — ہنوز: اب تک

رد و کد: سوچ بچار، بحث، تکرار

ڈے کیئر سینٹر (دارالاطفال): بچوں کی پرورش کا ادارہ

عقدہ: راز، پوشیدہ بات — مجوزہ: مقررہ

علم اور دولت

مرسلہ: شاہد حفیظ میلسی

مصر میں کسی جگہ دو بھائی رہتے تھے۔ ایک نے علم پڑھا اور دوسرا مال جمع کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے والا تو علامہ بن گیا اور روپیہ جمع کرنے والا شاہی خزانچی بن گیا۔

ایک بار دولت مند نے عالم بھائی کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا: ''ہم تو خزانے کے مالک ہو گئے مگر تم مفلس ہی رہے''۔

عالم بھائی نے کہا: ''بھائی جان! میں تو اس حال پر خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے پیغمبروں کی میراث (علم) عطا فرمائی ہے مگر آپ ہیں کہ فرعون کی وراثت (یعنی مصر کی حکومت) پر اترا رہے ہیں''۔

ڈھونڈو گے تو جانیں گے...... ورنہ ہم نہ مانیں گے

اس منظر نے انھیں اپنے ضمیر کے سامنے مجرم بنا دیا تھا

صداقت حسین ساجد

"کتنی فیس ہے بابو!"

اس نے مریض کو نجی ہسپتال میں داخل کرانے سے پہلے کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے پوچھا۔

"مریض کو کیا ہوا ہے؟"

"مریض کے دماغ میں رسولی ہے۔"

"اگر آپریشن کرنا پڑا، تو کم سے کم دو لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔"

"دو لاکھ......؟" فیس سن کر وہ گھبرا گیا۔

"جی ہاں!"

"اتنی رقم تو شاید جھونپڑی بیچ کر بھی نہ بنے۔" اس کے پاس کھڑی اس کی امی نے کہا۔

کاؤنٹر والے نے ان دونوں ماں بیٹے کی حالت اور کپڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "مریض آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"مریض میرا شوہر ہے۔" خاتون نے کہا۔

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"ہم کچی مٹی کے برتن بناتے ہیں ...... بس! وقت عزت سے گزر رہا تھا کہ یہ مصیبت آن پڑی۔"

"میری بات مانیں، انھیں کسی سرکاری ہسپتال میں لے جائیں ...... وہاں حکومت کی طرف سے غریبوں کے لیے سہولت ہوتی ہے۔"

اس نے بینچ پر بیٹھے ہوئے مریض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جسے اس کے دوسرے بیٹے نے سہارا دیا ہوا تھا۔

"وہاں بھی گئے تھے......"

"تو کیا بنا؟"

"انھوں نے آپ کی طرف بھیج دیا۔"

"کیوں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ یہ رسولی کینسر کا باعث بن گئی ہے۔ ابھی آغاز ہے...... آپریشن سے ٹھیک ہو سکتی ہے...... انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر نذیر صاحب کے پاس لے جاؤ ...... فائدے میں رہو گے، اس لیے ہم یہاں آ گئے۔"

"انھوں نے ٹھیک کہا ہے، لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"یہ نجی ہسپتال ہے۔"

"ہمیں پتا ہے۔"

"پھر آپ کو رقم کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

اس نے یہ بتا کر دونوں ماں بیٹے کی طرف دیکھا، جو چپ چاپ کھڑے تھے۔ مریض کی آنکھیں بند تھیں اور اس کی گردن دوسرے بیٹے کے کندھے پر تھی۔

ڈاکٹر نذیر اپنے کمرے میں بیٹھے شارٹ سرکٹ سکرین پر دونوں ماں بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ مریض کی حالت کا انھیں اندازہ ہو رہا تھا۔ ویسے تو سکرین حفاظت کی غرض سے لگوائی گئی تھی، لیکن آج یہ سکرین ڈاکٹر صاحب کے دماغ کے پردے پر چھا گئی تھی۔ وہ ان کی باتیں سن کر اور حالت سے اندازہ لگا کر اپنے بچپن میں پہنچ گئے تھے۔

بچپن میں ڈاکٹر صاحب کا شمار اپنی جماعت کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ان کے امی ابو اتنے غریب تھے کہ انھیں اسکول کی کتابیں خرید کر بھی نہیں دے سکتے تھے۔ ماسٹر بشیر ان کے محلے دار تھے۔ بڑے اچھے انسان تھے۔ ہر سال اسکول کی کتابیں انھیں لے کر دیتے اور ساتھ میں ان کے دوسرے اخراجات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ سبب بنتے گئے اور وہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر وہ ڈاکٹر بن گئے، تو دکھی انسانیت کی خدمت کریں گے اور روپے پیسے کی کبھی پروا نہیں کریں گے۔ ان کی خواہش پوری ہوگئی اور وہ کامیاب سرجن بن گئے۔

کامیابی کئی بار انسان کو وہ قدریں بھلا دیتی ہے، جن کی وجہ سے زندگی خوب صورت لگتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی بھول گئے اور پیسا کمانے کی دوڑ میں مگن ہو گئے۔ ان کے جذبے اور

احساس برف کی طرح منجمد ہوگئے تھے۔
مریض کی حالت اور اس کے ورثا کی بے بسی نے انھیں جھنجھوڑ دیا تھا۔اس منظر نے انھیں ضمیر کے سامنے مجرم بنا دیا تھا۔آج انھیں سب کچھ یاد آ گیا تھا۔وہ اٹھے اور کمرے سے باہر آ گئے۔
''اس کو ہسپتال میں داخل کرو۔''
''ڈاکٹر صاحب! کیا مطلب؟''
''اس کا علاج مفت ہوگا۔'' انھوں نے کاؤنٹر والے شخص سے کہا تو وہ بہت حیران ہوا۔
اس نے ڈاکٹر صاحب کے منھ سے یہ جملہ پہلی بار سنا تھا۔اس نے عمل کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔
مریض کا کامیاب آپریشن ہو چکا تھا اور وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے مریض کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے سے لگائے اور کہا۔
''ان ہاتھوں میں کچی مٹی کی خوش بو ہے......جس نے میرے وجود میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔ میرے اندر سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا ہے اور میری پیشہ ورانہ سختی کو برف کی طرح پگھلا دیا ہے۔''
سب انھیں حیرت سے تک رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب ان صاحب سے بے نیاز کہے جا رہے تھے۔
''مجھے یاد دلا دیا ہے کہ انسان کو صرف کامیاب انسان نہیں بلکہ سچی قدروں والا انسان بننا چاہیے۔''
ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئے اور انھوں نے اپنے بٹوے میں سے ایک غریب دیہاتی کی تصویر نکال کر میز پر رکھی اور اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔
''ابا جی! مجھے معاف کر دیں......میں بھول گیا تھا کہ آپ بھی مٹی کے کھلونے بناتے تھے اور کہتے تھے۔
''کچی مٹی میں خوش بو ہوتی ہے......بیٹا!''
''ہاں ابا جی! کچی مٹی میں خوش بو ہوتی ہے۔ وہ انسان کو انسان سے پیار کرنا سکھاتی ہے......اب میں اسی خوشی میں زندگی گزاروں گا۔''

☆......☆

مشکل الفاظ کے معنی
شارٹ سرکٹ اسکرین: چھوٹی اسکرین

بادشاہ اور درویش

مرسلہ: شاہد حفیظ میلسی

ایک نیک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ ایک بادشاہ جنت میں ہے اور دوسرا ایک درویش دوزخ میں پڑا ہے۔وہ سوچ میں پڑ گیا کہ لوگ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ دوزخ میں ہوگا اور درویش جنت میں لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس نکلا۔معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ اچانک غیب سے آواز آئی۔
''یہ بادشاہ درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا اس لیے بہشت میں ہے اور اس درویش کو بادشاہوں کے تقرب کا بڑا شوق تھا اس لیے جہنم میں ہے۔''

پنجابی سے ترجمہ

حافظ بگّا

معروف احمد چشتی

ماسٹر صاحب اسمبلی میں علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کی تشریح کر رہے تھے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

خلیل سر جھکائے ماسٹر صاحب کی آواز سن رہا تھا۔ لفظ اس کو سنائی دے رہے تھے مگر مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
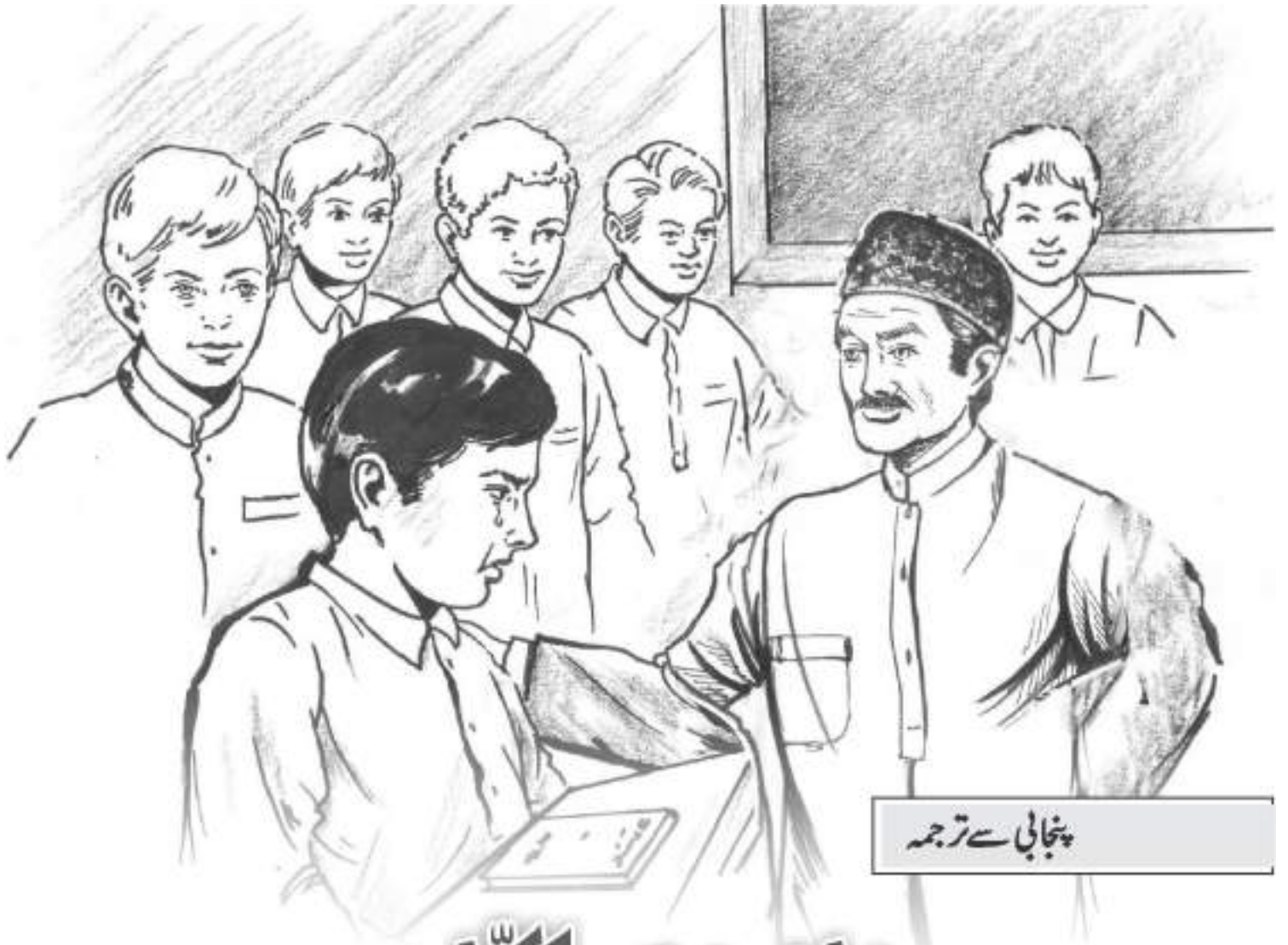
خلیل ایک انتہائی غریب گھر کا لڑکا تھا۔ غریب ہونا ہی کافی مصیبتوں کا باعث ہوتا ہے اوپر سے خلیل بیمار بھی تھا۔ اس کو ایک عجیب مرض لاحق تھا جس کی وجہ سے اس کا تمام جسم چتکبرا سا ہو گیا تھا۔ سر کے بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ دھوپ میں اس کو ٹھیک طرح سے دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ اسی وجہ سے گاؤں کے تمام لوگ اسے بگا بگا کہتے تھے۔ بگا پنجابی میں نامناسب قسم کے سفید رنگ کو کہتے ہیں۔

اسکول کے لڑکے اور گاؤں کے لوگ، اسے چھیڑتے

رہتے۔ کوئی اسے انگریز کہتا تو کوئی اسے 'سفید بندر' کہہ کر پکارتا۔ گاؤں کے ہر فرد نے اپنی طرف سے ایک نام خلیل کو دے رکھا تھا۔ بگا بڑے شوق سے اسکول پڑھنے جاتا تھا مگر سارا اسکول اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ وہ بے چارا رو دھو کر گھر آ جاتا۔ گھر میں بھی باپ سے مار پڑتی کہ اسکول سے بھاگا کیوں۔

جب بگا شریر لڑکوں کی وجہ سے اسکول میں نہ پڑھ پایا تو اس کا باپ اسے قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے دوسرے گاؤں کے مدرسے میں چھوڑ آیا۔ وہاں بھی لڑکے اس کو سکھ کا سانس نہ لینے دیتے۔ طلبا کے لیے گاؤں سے جو کھانا اکٹھا ہوتا وہ دوسرے طلبا کھا جاتے اور بگا بے چارا بھوکا رہ جاتا۔ مدرسے میں شرارت کوئی دوسرا لڑکا کرتا مگر نام بگے کا لگ جاتا۔ مولوی صاحب سائیکل کے ٹائر سے بنے مولا بخش سے مار مار کر بگے کی چمڑی اُدھیڑ ڈالتے۔ وہ بے چارا چپ چاپ مار برداشت کر لیتا۔ مدرسے میں آ کر اس کو نابینا حافظ کا خطاب بھی ملا۔ بگے کو یہ سب کچھ بے حد بُرا لگتا تھا مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ یہ موسم سرما کی ایک یخ رات تھی۔ مدرسے کے طلبا کو شرارت سوجھی۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ اُنھوں نے حافظ بگے کو رضائی سمیت اُٹھایا اور گاؤں سے باہر گندے پانی کے جوہڑ میں پھینک آئے۔ برف جیسے ٹھنڈے پانی میں گرنے کے بعد بگے نے بہت شور مچایا مگر سارا گاؤں لحافوں میں دُبکا پڑا تھا۔ اس کی آواز کون سنتا۔ شدید سردی میں بگا تھر تھر کانپنے لگا۔ سردی سے اس کے ہاتھ پاؤں نیلے پڑ گئے۔ وہ گرتا پڑتا جوہڑ سے نکلا۔ اب مدرسہ اس کے لیے محفوظ جگہ نہ تھی۔ وہ کہاں جاتا۔ پناہ لینے کے لیے اسے اور تو کوئی جگہ نہ ملی، وہ ایک تنور کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ رات کے اس پہر ٹھنڈا تنور بھی اسے آرام نہ دے سکا۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ نیند کیسے آتی۔

بگا ٹھٹھرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہر جگہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لڑکے اس کا مذاق کیوں اُڑاتے ہیں؟ کیوں ہر ایک اس کو مارتا پیٹتا ہے؟ اس کے پاس اپنے کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ مدرسے سے بھاگ جائے گا اور بھاگ کر ایسی جگہ جائے گا جہاں کوئی بھی اس پر ظلم ڈھانے والا نہ ہو۔

بگا اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرایا کہ شاید مدرسے کے شریر لڑکے اسے تنگ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ مگر یہ تو صوفی سرور صاحب تھے۔ صوفی صاحب مسجد کے خادم تھے اور رات کے پچھلے پہر تہجد کے نوافل ادا کرنے مسجد جا رہے تھے۔ اُنھوں نے بگے کو دیکھا تو حیران و پریشان ہو گئے۔ سردی کے مارے بگے سے ایک لفظ بھی بولا

نہیں جا رہا تھا۔ وہ نیم پاگلوں کی طرح رو رہا تھا۔ صوفی صاحب بگے کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ اس کو اپنے بیٹے کا لباس پہنا کر بستر پر لٹایا۔ صوفی صاحب کی بیوی نے دودھ گرم کر کے اسے پلایا۔ جب خاصی دیر بعد بگے کے حواس بحال ہوئے تو اس نے صوفی صاحب کو تمام ماجرا سنایا۔ صوفی صاحب بولے: ''اب تم مدرسے سے بھی بھاگ جانے کا سوچ رہے ہو گے؟''

''ہاں جی۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں۔'' بگے نے جواب دیا۔

''مگر اس طرح تم کہاں کہاں سے بھاگو گے؟ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے میرے بیٹے۔'' صوفی صاحب نے کہا۔

''تو پھر کیا ہر جگہ اسی طرح مار کھاتا رہوں؟'' بگے نے بددل ہو کر کہا۔

''نہیں بیٹا ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تھی تو ان کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمت نہیں ہاری اور آخرکار رب کے دین کو پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ہمیں سب سے بڑا سبق یہی ملتا ہے کہ کبھی بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ تم بھی ہمت نہ ہارو اور مسئلے کا صحیح حل تلاش کرو۔'' صوفی صاحب نے مٹھاس بھرے لہجے میں بگے کو سمجھایا۔

''مگر میں حل کہاں سے ڈھونڈوں۔ کوئی بھی میری بات نہیں سمجھتا۔'' یہ کہتے ہوئے بے بسی کے مارے بگے کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔

''دیکھ پتر، غلطی تیری اپنی ہے۔ تو کمزور ہے نہیں مگر خود کو کمزور سمجھ بیٹھا ہے۔ تو مدرسے میں چپ چپ نہ رہا کر۔ سب کے ساتھ گھل مل کر رہا کر۔ اچھے اچھے دوست بنا، تا کہ تیری طاقت میں اضافہ ہو۔ پھر کوئی بھی تجھے تنگ نہیں کر سکے گا۔ کیا تو ایسا نہیں کر سکتا؟''

صوفی صاحب نے کھل کر بات سمجھائی تو بگا حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوش گواری کا احساس ابھر آیا۔ یوں جیسے اسے کوئی نیا خیال سوجھ گیا ہو۔ اسے لگا کہ واقعی مسئلے کا حل تو اس کے پاس ہے وہ خواہ مخواہ دوسروں سے اس کے حل کی امید لگائے بیٹھا تھا۔

اگلے روز بگا مدرسے میں آیا تو سب لڑکے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مگر بگے نے ان کی ہنسی کا برا نہ مانا۔ وہ خود کو بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے گزشتہ رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کھانے کے وقت اس نے اپنے حصے کی آدھی روٹی اپنے ایک ساتھی کو دے دی۔ اس طرح وہ بگے کا پکا دوست بن گیا۔ دوپہر کو آرام کے وقت اس نے لڑکوں کو دو مزے دار قسم کے لطیفے سنائے۔ لطیفے اس کے پاس بہت تھے مگر وہ خاموش رہتا تھا کہ کہیں لڑکے اس کا مذاق نہ اُڑائیں۔ لیکن اب وہ بولنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لڑکے حیران تھے

کہ بگے کو راتوں رات ہو کیا گیا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ تبدیلی کیسے آئی تھی۔

بگے نے حالات سے سبق سیکھ لیا تھا کہ مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے تو خود ہی ہمت کرنا ہوگی۔ کھل کے بولنا پڑے گا اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے دوست بھی بنانے ہوں گے۔ چند دنوں میں بگے نے کافی دوست بنالیے جو اس کا خیال رکھتے تھے۔ کھل کر بولنے سے اس میں خود اعتمادی آگئی تھی اور اب وہ مدرسے میں تقریر بھی کرنے لگا تھا۔

ایک دن اسکول کے کچھ لڑکے بگے کو ملے تو انھوں نے بگے کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی۔ بگے نے اپنے دوستوں کو بلایا اور اسکول کے لڑکوں کی خوب پٹائی کی۔
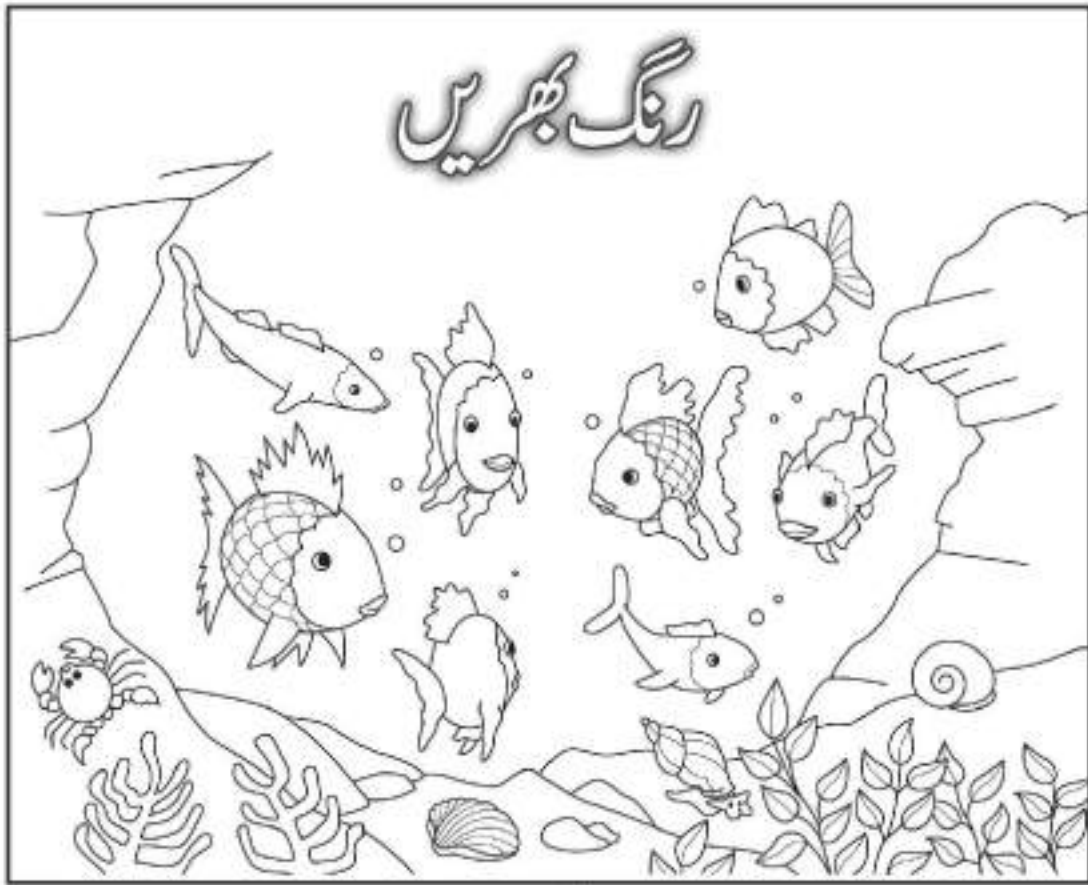
اس کے بعد تو کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ بگے کا مذاق اُڑا سکے۔ اب وہ حافظ بگا سے حافظ خلیل بن چکا تھا۔ اپنے اساتذہ کی آنکھوں کا تارا۔ تقریر، تلاوت میں سب سے آگے۔ اس کی ہمت نے اسے جینے کا ڈھنگ سکھا دیا تھا۔ آج اسے علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے کی شرح اس کی سمجھ میں آگئی تھی......

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

☆☆☆

"میں کہتا ہوں کہ اس بلا کی گرمی میں تمھیں سمندر کی سیر پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو کتنی دھوپ ہے باہر اور ویسے بھی مجھے اپنا رنگ کالا کروانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" ہم نے بھولے میاں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ بھولے میاں اتوار کو آئے اور آتے ہی ہمارا گھر پر آرام سے سونے کا ارادہ خاک میں ملا دیا اور ہمیں سمندر کی سیر کے لیے چلنے پر اصرار کر رہے تھے۔

سمندر کی سیر

محمد طلحہ نذیر

''ارے بھائی! کتنی مرتبہ تم کو بتاؤں کہ لاہور سے اچانک میرے دو ماموں حضرات کی تشریف آوری ہوئی ہے اور ان کے ساتھ ایک لشکرِ طفل بھی آیا ہے جس نے میرے اتوار کے دن کا سکون غارت کر دیا ہے اور صبح سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ ہمیں سمندر کی سیر کو جانا ہے۔''

''تو تمھارے ماموں حضرات کیوں نہیں لے جاتے؟'' ہم نے وضاحت طلب کی۔

''ارے بھائی ان سب کو سمندری آب و ہوا سے الرجی ہے۔ ان کو وہاں کا ماحول اچھا نہیں لگتا۔'' بھولے میاں نے وضاحت کی۔

بھولے میاں ہمارے دوست تھے اور وہ بھی اکلوتے، لاڈلے، لنگوٹیے، بلکہ قمیصیے اور کرتیے بھی۔ ان کی اس (اتوار کے دن کے آرام کو خاک میں ملانے والی) داستان نے ہمیں غمگین کر دیا تھا کیوں کہ یہ ہم ہی جانتے تھے کہ پورا ہفتہ کام کر کے اتوار کے دن سونے کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ خیر ہم نے ان کی مدد کا فیصلہ کیا۔

''تو پھر کیسے چلنا ہے؟'' ہم نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا کیوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ بھولے میاں بے کار ہیں یعنی ان کے پاس کوئی کار نہیں تھی۔

''میں نے اعظم صاحب سے بات کر لی ہے۔ اُنھوں نے چھوٹی گاڑی کرائے پر دی ہے۔ فی الحال بڑی گاڑی موجود نہیں ہے۔'' بھولے میاں نے اس کی بھی وضاحت کر دی۔ اعظم صاحب ہر دل عزیز پڑوسی تھے اور وہ گاڑیاں لوگوں کو کرائے پر دیا کرتے تھے۔

''اور اس کی آگ بجھانے کا کیا انتظام ہے؟'' ہم نے اپنے گول مٹول سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''بریانی.....'' ابھی انھوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہماری رال ٹپکنے لگی اور ہم نے جانے کی ہامی بھر لی کیوں کہ بریانی اور ہمارا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یوں ہم نے اپنا سامان باندھا اور بھولے میاں کے ساتھ ان کے گھر کی جانب نکل پڑے۔ ابھی ہم بھولے میاں کہ گھر کے مہمان خانے میں کھڑے تھے کہ بھولے میاں ذرا شربت کا انتظام کروا دیں۔ اچانک ڈرائنگ روم میں سات، آٹھ سال کا ایک پیارا سا لڑکا نمودار ہوا اور داخل ہوتے ہی ہمیں سلام کیا، پھر صوفے کی جانب بڑھا اور مُڑ کر سے نکل گیا۔

بھولے میاں جیسے ہی داخل ہوئے ہم نے ان کے ہاتھ سے شربت کا گلاس پکڑا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے: ''تم تو کہہ رہے تھے کہ تمھارے ماموں کے بچے بڑے شریر ہیں جب کہ وہ تو معصوم ہیں اور.....'' اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی، اچانک ہمارے نیچے ایک دھماکا ہوا اور ہم اچھل پڑے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ پھر اس بچے کی شرارت سمجھ میں آئی جو چپکے سے صوفے پر ایک غبارہ رکھ گیا تھا۔ خیر ہم بُرے بُرے

منہ بنا رہے تھے اور بھولے میاں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ آخر سارا سامان لے کر ہم باہر نکلے، گاڑی پر دیگ لادی اور پھر ہم اس پر سوار ہو گئے۔

بھولے میاں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ بچوں کی تعداد کُل سات تھی۔ بلال، نعیم اور شبان پہلے ماموں افضل کے بیٹے تھے جب کہ طلحہ، شہزاد، اسلم اور اکرم دوسرے ماموں اکمل کے بیٹے تھے۔ دو بچے بھولے میاں کی برابر والی نشست پر بیٹھ گئے۔ بقیہ چھ کے چھ ہمارے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے اور ہم نے اس خیال سے آنکھیں موندھ لیں کہ سمندر پہنچتے پہنچتے بھی کافی آرام کیا جا سکتا ہے۔

☆......☆

وہ جگہ بے حد خوب صورت تھی۔ چاروں طرف سے خوب صورت پہاڑوں میں گھری وہ چھوٹی سی وادی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ایک ندی سانپ کی طرح بل کھاتی چلی آ رہی تھی اور ہم حیران ہو رہے تھے کہ سمندر میں اتنا خوب صورت منظر کیسے آ گیا۔ اِدھر بہت سے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے شاخیں عاجزی سے جھکی ہوئی تھیں۔ ہم نے جھٹ سے ایک آڑو توڑا۔ ابھی ہم آڑو کو اپنے منھ کے قریب لے کر گئے ہی تھے کہ ایک دم ایک دھماکا سا ہوا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا چھٹا تو نہ وہ خوب صورت وادی تھی اور نہ وہ آڑو۔ ہم گاڑی میں اپنا سا منھ لیے بیٹھے تھے اور بچے شور مچا رہے تھے کہ: ”سمندر آ گیا! سمندر آ گیا“ وہ دراصل دھماکا نہیں تھا بل کہ بھولے میاں نے گاڑی کو ایک زوردار جھٹکے سے روکا تھا، جس کے نتیجے میں ہم آڑو کھانے سے محروم ہو گئے تھے اور ایک حسین خواب سے بیدار ہو گئے تھے۔ بھولے میاں گاڑی سے اُترے اور سب بچے بھی اُتر گئے۔ دور سے سمندر کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور سمندری پانی کی مخصوص مہک آ رہی تھی۔ چاروں طرف فیکٹریاں تھیں، جن کی چمنیوں سے دھویں کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ کئی لوگ سمندر میں غوطہ زن تھے اور کچھ ساحل پر بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے تو کچھ بچے مٹی سے کھیل رہے تھے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کرائے پر لی اور اپنا سارا سامان اس میں رکھ دیا۔

بچے کچھ زیادہ ہی پُرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ ہم سب ساحل پر آ گئے۔ ساحل سمندر پر فضا بہت خوش گوار تھی۔ پیڑوں کی بھرمار تھی۔ ابھی ہم سمندر میں غوطہ لگانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اچانک ایک بھٹا اچھلتا ہوا آیا اور اسلم کی آنکھ میں آ کر لگا۔ وہ بے چارہ وہیں بیٹھ کر اپنی آنکھ مسلنے لگا۔ ہم نے دیکھا تو دو شریر لڑکے ایک دوسرے کو بھٹے مارنے میں مصروف تھے جن میں سے ایک کا نشانہ خطا ہو گیا اور بے

چارے اسلم کی آنکھ پر جالگا۔ ہم نے اس کو اُٹھا کر ایک ناریل کی درخت کی چھاؤں میں بٹھادیا۔ بھولے میاں نے اس کو آنکھ مسلنے سے منع کیا۔ اب ہم دو شریر لڑکوں کو سبق سکھانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے سر پر ایک دھماکا ہوا اور ہمیں دنیا گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ہم ستارے گننے لگے جو کہ دن میں نظر آنے لگے تھے۔ ان بدمعاش لڑکوں کی دیکھا دیکھی اور بھی لڑکوں نے مختلف چیزیں اٹھا کر کھیل کھیلنا شروع کر دیے تھے اور جو ہمارے سر پر دھماکا ہوا تھا، وہ دراصل دھماکا نہیں تھا بلکہ کسی نے پانی سے بھری بوتل ہوا میں اچھالی تھی جس کی لینڈنگ ہمارے سر پر ہوگئی تھی۔

''بھائی جان اگر لوگ صفائی کا خیال رکھیں تو کتنے لوگ تکالیف سے بچ جائیں۔'' بلال نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بات میں واقعی دَم تھا کیوں کہ پورا ساحل کچرے سے بھرا پڑا تھا۔ جگہ جگہ بھٹے پڑے نظر آرہے تھے، بسکٹ کے ریپرز کا الگ اجتماع تھا۔ بوتلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

''صحیح بات ہے! ہمیں کسی بھی مسلمان کے لیے تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہیے۔'' بھولے میاں نے اس کے خیال کی تائید کی۔

''بھائی جان! کیوں نہ ہم اس جگہ کی صفائی کریں۔ مزا بھی آئے گا اور اس سے لوگوں کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔'' اکرم جو اسلم کا چھوٹا بھائی تھا، اس نے رائے پیش کی۔

''چلو کیوں نہیں!'' ہم نے بھی ان بچوں کے خیال کی تائید کی۔

چناں چہ سب نے ایک ایک تھیلی تھامی اور لگے ساحل پر موجود کوڑا اٹھانے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ساحل صاف تھا اور لوگ ہمیں عجیب عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ ہماری دیکھا دیکھی سب نے کوڑا ڈبوں میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شریر بچے بھی اب ہماری مدد کر رہے تھے۔ جس چیز کو ہم خود گندا کرتے ہیں اس کو صاف کرنے میں شرم کیسی۔ صفائی سے فارغ ہو کر ہم نے پھر سے چھلانگیں لگانے کی تیاری کی اور پانی میں غوطہ زن ہوگئے۔ سب بچوں نے خوب مستی کی۔ جس طرف ہم تھے وہ جگہ بہت صاف ستھری تھی اور جس طرف فیکٹریاں تھیں وہاں پانی میں بہت گندگی تھی۔

''بھائی جان! ایک بات پوچھوں؟'' نعیم نے سوال کیا جو بلال کا بڑا بھائی تھا۔

''جی ضرور...'' ہماری جگہ بھولے میاں بولے۔

''ہمارے سائنس کے استاد بتا رہے تھے کہ ان فیکٹریوں کا فاضل مادہ سمندروں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پانی آلودہ ہو جاتا ہے اور اس کا درجۂ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ جس سے آبی حیات کو نقصان پہنچتا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

”نعیم! آپ کے استاد نے بالکل درست کہا ہے۔ یہ جو فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں ہے اس کی وجہ سے نہ صرف سمندری زندگی بلکہ انسانوں کو بھی بہت نقصان پہنچتا ہے۔ سمندر کے کنارے بسنے والے غریب خاندانوں کی زندگی بھی اسی وجہ سے متاثر ہوتی ہے۔ اگر ہم فاضل مادے کو ’ری سائیکل‘ کریں تو اس کی وجہ سے جان داروں کی صحت بھی بچ سکتی ہے اور ہم اس سے کئی اور چیزیں بھی بنا سکتے ہیں۔“ بھولے میاں نے وضاحت کی اور ہم سوچ رہے تھے کہ آخر ہمارے ملک کو خراب کرنے میں ہمارا ہی ہاتھ ہے۔ اگر اس ملک کا ہر شہری یہ نیت کرلے کہ وہ اپنے طور پر اس ملک کو صاف رکھے گا تو عجب نہیں کہ ہمارا ملک صاف ستھرا ہوگا۔

نہانے کے بعد ہم نے جھونپڑی کے اندر بریانی کے مزے لوٹے۔ اس کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی۔ گاڑی میں ہم بیٹھے یہی سوچ رہے تھے کہ جس سیر پر آنے کے لیے ہم ”نا! نا!“ کر رہے تھے، وہاں جانے سے ہمیں کتنا فائدہ ہوا اور کتنا مزہ بھی آیا۔ یہ بچے تو واقعی بہت شریف نکلے۔ ہم اپنے دل میں یہ عزم کرچکے تھے کہ اپنے ملک کو صاف ستھرا بنانے میں جو ہم سے ہوسکے گا، ہم کرگزریں گے اور شاید باقی بچے بھی یہی کچھ سوچ رہے تھے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے

اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَان

”طہارت و پاکیزگی نصف ایمان ہے۔“

☆......☆

مشکل الفاظ کے معانی

لشکرِ طفل: بچوں کا ہجوم

چمنی: دیوار میں وہ سوراخ جس میں سے چولھے میں سے آگ جلنے سے دھواں نکلتا ہے

آبی حیات: پانی میں رہنے والے جاندار

فاضل مادہ: فالتو یا استعمال شدہ مواد

سونے کی اینٹ — مرسلہ: شاہد حفیظ میلسی

ایک نیک آدمی کو کہیں سے سونے کی اینٹ مل گئی۔ دنیا کی اس دولت نے اس کے دل کا سکون چھین لیا اور وہ ساری رات یہی سوچتا رہا کہ اب میں سنگِ مرمر کی ایک عالی شان حویلی بنواؤں گا، بہت سے نوکر چاکر رکھوں گا، عمدہ غذا کھاؤں گا اور اعلیٰ درجے کا لباس سلواؤں گا۔ غرض اسی خیال نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ نہ کھانا پینا یاد رہا اور نہ اللہ کا ذکر۔ صبح کو اسی خیال میں گم جنگل میں نکل گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص ایک قبر پر مٹی گوندھ رہا ہے تاکہ اس سے اینٹیں بنائے۔ یہ منظر دیکھ نیک آدمی کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے خیال آیا کہ مرنے کے بعد میری قبر کی مٹی سے بھی لوگ اینٹیں بنائیں گے۔ عالی شان مکان، اعلیٰ لباس اور عمدہ کھانے سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔ اس لیے سونے کی اینٹ سے دل لگانا بے کار ہے۔ ہاں دل لگانا ہے تو اپنے رب سے لگا۔ یہ سوچ کر اس نے سونے کی اینٹ کہیں پھینک اور پھر پہلے کی طرح تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے لگا۔

اگر بڑی بہن اور چھوٹے بھائی کا ساتھ ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ آپا جان کس طرح حکم چلاتی ہیں؟ اکثر ہمارے خلاف امی کے کان بھی بھرتی رہتی ہیں۔ جب کہ چھوٹا بھائی کسی شرارت میں پکڑا جائے تو فوراً رونی سی صورت بنا کر ڈانٹ سے بچ جاتا ہے۔ درمیان والا ہمیشہ پھنستا ہے اور باتیں سنتا ہے چاہے وہ کچھ کرے یا نہ کرے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ چونکہ ہمارا دوسرا نمبر ہے، ہم سے بڑی ایک خرانٹ آپا اور ایک چھوٹا چیتے جیسا بھائی ہے تو ہمارا بھی جانور بن جانا ناممکن بات نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ جتنے بھی واقعات پیش آتے ہیں ان میں بیشتر نقصان ہمیں ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ چلیں آپ کو ایک واقعہ سناتی ہوں۔

ہوا یوں کہ تین دن کی چھٹی کے بعد اسکول کھلا، تو ہمارا کام نامکمل تھا۔ جب میں کام کرنے کے لیے بیٹھی تو قلم نے چلنے سے انکار کر دیا۔ امی کچھ لینے باہر جا رہی تھیں، ڈرتے ڈرتے ان سے کہا۔ ''ایک قلم لے آئیے گا'' کچھ لمحے انتظار کے گزرے۔ تھوڑی دیر میں امی قلم لے آئیں تو جلدی جلدی لکھنا شروع کی۔ جونہی کام ختم ہوا قلم بستر پر رکھا اور بستہ تیار کرنے لگی۔ جب کمرے میں واپس آئی تو

قلم جگہ پر نہیں تھا۔ میں سمجھی کہ نیچے گر گیا ہے لیکن ہر جگہ ڈھونڈنے کے باوجود وہ گدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب ہو گیا تھا۔ امی جو کافی دیر سے دیکھ رہی تھیں بولیں: ”کیا ہوا؟“

”وہ وہ میرا قلم!“ میں جھجکتے ہوئے بات مکمل نہ کر پائی تھی کہ امی کہنا شروع ہوئیں۔ ”چیز سنبھال کر رکھا کرو، ہر نئی چیز گم کر دیتی ہو“ یہ کافی دیر چلتا رہا۔ ایک نئے قلم کا اس طرح غائب ہو جانا کچھ پراسرار معاملہ تھا جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تو ڈھونڈنا چھوڑ دیا کہ خود مل جائے گا۔ آخر سونے کے لیے تکیے پر سر رکھا تو کوئی چیز بُری طرح چبھی، فوراً غلاف کے اندر ہاتھ ڈالا تو قلم نکلا۔ اُف! یہ یہاں کیسے آ گیا؟ اوہ! تو یہ نیا طریقہ ہے تنگ کرنے کا۔ ہم بڑبڑائے۔ خیر قلم مل جانے کا کسی سے تذکرہ نہ کیا کیوں کہ یہ دونوں کی ملی بھگت تھی۔ البتہ آئندہ کے لیے اپنی چیزوں کو ان کے ہاتھ نہیں لگنے دیا۔

☆......☆

ہر وقت روک ٹوک، ہر جگہ نصیحتیں، یہ میری دونوں پیاری آپیوں کا تعارف ہے کسی حکیم سقراط کا تذکرہ نہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ امی جان نے ماموں جان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمارے کزن رات میں حیدرآباد اپنی نانی سے ملنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

اب ہم ماموں کے گھر میں اکیلے تھے۔ میں اور چھوٹی آپی سیر کرنے کے لیے قریبی پارک چلے گئے۔ بڑی آپی کی ہدایات کی روشنی میں چھوٹی آپی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہاں کشمیر کے حوالے سے پروگرام ہو رہا تھا۔ ہم نے بھی وہاں جا کر اور بچوں کے ساتھ مل کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

وادی کشمیر جنت نظیر، کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی، سب بچوں نے مل کر نقشوں میں رنگ بھرے اور ترانے بھی پڑھے۔ پھر چپس اور چاکلیٹ کھا کر واپس آ گئے۔ گھر پہنچ کر جب سب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تو میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے بستے سے گیند نکالی اور دیوار پر مارنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی ”ہمت نہ ہار“ ......”جیت ہے تیرا نشاں“ گانا شروع کر دیا۔ تیر کی طرح آپی ہماری طرف لپکیں: ”کیوں اچھال رہے ہو؟ سب سو رہے ہیں، اگر ماموں اُٹھ گئے تو ہم دونوں کو ڈانٹ پڑے گی چلو آ کر سو جاؤ۔“

یوں گیند کی طرح ہمیں بھی کمبل میں گھسا دیا گیا۔ عصر کی اذان سن کر اُٹھا، وضو کیا، نماز پڑھی۔ آپی کو بھی اُٹھایا اور نماز پڑھوائی۔ پھر چھت پر کھیلنے لگا۔ اتنے میں آپی بھی آ گئیں۔ ”کیوں کھیل رہے ہو؟ دودھ کپ میں نکال کر رکھ دیا ہے

جا کر پیو۔"

نیچے آ کر دودھ پینے کے بعد خالہ سے کمپیوٹر کھولنے کی اجازت لی۔ ابھی گیم کھولا ہی تھا کہ آپی آگئیں: "اسکرین گیم! آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔"

میں وہاں سے منھ بنا کر اُٹھا اور سامنے الماری سے "ماہنامہ ساتھی" کر پڑھنے لگا۔

"اتنی مدھم روشنی میں کیوں پڑھ رہے ہو؟"

یہ صرف ایک چھٹی والے دن کی تفصیلات ہیں۔ کتنا مشکل ہے دو بڑی بہنوں کا چھوٹا بھائی بننا۔

☆......☆

میں ہوں بڑی

حفصہ ملک

بھائی اور بہن ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر اس کو چھیڑا جائے تو سوائے ہائے ہائے کے کچھ حاصل نہیں، یہ ایک بڑی مگر دُکھی بہن کے دل و دماغ کی آواز ہے۔ عمر، قد، عقل جب ہر چیز میں بڑے ہوں تو کھانے پینے، آرام کرنے اور تفریح میں بھی بڑا حصہ ملنا چاہیے۔ مگر ہمیں صرف کام میں بڑا حصہ ملتا ہے۔ کچھ جھلکیاں اپنے بہن بھائی کے ساتھ گزارے طوفانی لمحات کی آپ کے سپرد۔

کہنے کو تو چھوٹی بہن مگر رعب اتنا ہے کہ ہمیں ہر بات میں حکم نہیں بلکہ درخواست کرنی پڑتی ہے۔ جب کبھی اردو نظموں کی تشریح کا مرحلہ پیش ہو (جو عموماً ہمارے قابو سے باہر ہوتی ہے مگر ہم ذہن پر زور ڈال کر موضوع اور مشکل

الفاظ کے معانی کو گھیرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں) تو ہمارے دائیں بیٹھی بہن کے لبوں سے کوئی نہ کوئی ترانہ اُبل پڑتا ہے اور پھر سب کچھ بھک سے اُڑ جاتا ہے اور ہم بے بس ہو کر سر پیٹتے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی علوم کے جوابات ڈھونڈنے کے دوران (اُف کتنے مشکل، کبھی جو کتاب میں مل جائیں، ہمیشہ اپنی طرف سے چھاپنا پڑتا ہے) بول اور کھیل کر ہمارا جی جلاتے ہیں۔ ایسے میں ہماری "پوزیشن" پر بھی اثر پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کی ضد ہمارے بھائی بہن پڑھائی کے علاوہ ہماری نیند کے بھی بلاوجہ دشمن ہیں۔ دن میں خود آرام کرتے ہیں نہ ہمیں کرنے دیتے ہیں اور صبح میں تو اتنا شور مچاتے ہیں کہ ہمیں ساڑھے سات سے پہلے ہی بستر چھوڑنا پڑتا ہے (جبکہ اسکول آٹھ بجے لگتا ہے)۔

ہم تینوں امی ابو کے ساتھ پچھلے سال رمضان میں تراویح کے لیے مسجد جاتے رہے۔ بھائی دن میں سونے یا لیٹنے کو غلط سمجھتا ہے لیکن نیت کرتے ہی جھومنے لگا اور پھر پہلے ہی سجدے میں نیند پوری کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ تراویح کے بعد امی نے اٹھایا، ہلایا، جلایا تو بمشکل چند قدم چل کر گھاس پر سجدہ ریز ہو گیا۔ اردگرد سب کا ہنس ہنس کر بُرا

حال تھا۔

حسرت ہے کہ ابو کو اپنے شاندار نمبر ہم خود دکھائیں مگر ابو کے گھر میں داخل ہوتے ہی خبریں جاری ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں خبر رسانوں سے کوئی معاملہ چھپا نہیں رہ سکتا۔ اب ہم بھی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھیں اور دونوں کی کوئی کمزوری ابو کو بتا سکیں۔ اُمید ہے کہ کبھی موقع مل جائے گا۔

نئی چال

محمد اویس محمود

بھیڑیے خونخوار تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی ان میں چالاکی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ہم سب کو تو معلوم ہی ہے کہ بھیڑیوں کو کھانے کے لیے ہر دن نئے نئے جانوروں کی تلاش ہوتی ہے۔ ایک دن اُنھوں نے آپس میں مل کر سوچا کہ کیوں نہ وہ پہاڑی بکروں سے جنگ کا اعلان کر دیں۔ اس طرح ایک ہی دفعہ میں انھیں ڈھیر سارا گوشت کھانے کو مل جائے گا اور جنگل میں ذرا دھاک بھی بیٹھ جائے گی۔ یہ سوچ کر بھیڑیوں نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ایک طرف بھیڑیے تھے تو دوسری طرف پہاڑی بکروں کا غول تھا۔ پہاڑی بکروں نے یہ سمجھداری کی کہ جنگلی کتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ مگر پہاڑی بکروں کے پاس کاٹنے والے کتوں کی پلٹن موجود تھی۔ کچھ ہی دیر میں بھیڑیے جان بچا کر بھاگتے نظر

آ رہے تھے۔

بھیڑیے ہار تو گئے مگر انھوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا دل میں پکا ارادہ کر لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک طرف بکروں اور کتوں میں جیت کی خوشی منائی جا رہی تھی تو دوسری طرف بھیڑیے سر جھکائے اپنی اگلی چال کے متعلق سوچتے رہے۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ بکروں کو اپنے علاقے میں بلا کر کسی طرح گھیرا جائے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی چالاکی سے ایک خط لکھا جس کا مضمون تھا:

''ہم تمام جانوروں کو جنگل میں دوستی و بھائی چارے سے رہنے کا پورا پورا حق ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف جنگ چھیڑ کر ہم نے یقیناً بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اب اگر پہاڑی بکرے اجازت دیں تو ہم ایک دوسرے سے دوستی نبھانے کے لیے اپنے کچھ سر سبز علاقے آپ کو تحفے میں دینا چاہتے ہیں بدلے میں آپ صرف ہمیں اپنے جنگلی کتوں کا غول دے دیجیے۔ خط جیسے ہی بکروں کے پاس پہنچا، وہاں تو کھلبلی مچ گئی۔ بھیڑیے جیسے خطرناک جانور امن کا پیغام دیں تو بھلا اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ فوراً ہی

جواب تیار کیا گیا اور بھیڑیوں کا شکریہ کہہ کر ان کے ارادے کو بہت ہی نیک قرار دیا گیا۔ بھیڑیوں کے کنبے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کا آدھا منصوبہ تو مکمل ہو ہی گیا تھا۔ یعنی اگر بکرے ان کی بدنیتی بھانپ لیتے تو خط کا جواب ہی نہیں دیتے۔ یہاں تو نہ صرف جواب فوراً آ گیا بلکہ بکروں نے ان کی بات بھی مان لی تھی بس چند روز میں بکروں نے اپنے کتوں کا غول بھیڑیوں کے پاس روانہ کردیا اور بھیڑیوں کے دیے ہوئے علاقے میں چرنا شروع کردیا۔

بکروں کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کو ایک سرسبز علاقہ مل گیا اور بھیڑیوں سے دوستی بھی ہوگئی۔ دوسری طرف بھیڑیوں کی چال کامیاب ہوگئی کیونکہ ان کے پاس کاٹنے والے کتوں کی پلٹن موجود تھی۔ ایک دن جب بکرے بھیڑیوں کے دیے ہوئے علاقے میں گئے تو بھیڑیوں نے اُن بے وقوف بکروں پر حملہ کردیا اور بکروں کا جو حشر ہوا۔ اس کا ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔ ذرا سی دیر میں جنگل کا ہرا میدان زخمی اور مرے ہوئے بکروں سے بھرا ہوا تھا۔ جو بکرے زندہ بچ گئے تھے وہ کراہ کراہ کر توبہ کررہے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے کہ کسی وحشی جانور پر کبھی بھروسا مت کرنا۔

☆......☆

پہرے دار

روبینہ ناز

کسی زمانے میں ایران کے سوداگر اپنا قیمتی سامانِ تجارت

لے کر شام جاتے تھے اور وہاں اُسے بیچ کر منافع کماتے تھے۔ ان کے راستے میں ایک خطرناک موڑ آتا تھا۔ سبھی سوداگر کوشش کرتے تھے کہ رات ہونے سے پہلے ہی اس خطرناک موڑ سے گزر جائیں کیوں کہ اس موڑ پر ڈاکوؤں کا راج تھا۔ ایک بار سوداگر اس خطرناک موڑ کے پاس پہنچے اور رات ہوگئی اب تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ایسے میں ایک سوداگر نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم اپنا سامانِ تجارت کسی غار میں چھپا دیں۔ تاکہ ڈاکوؤں کو پتا نہ چل سکے۔ جب وہ ہمیں لوٹنے آئیں گے تو ہمارے پاس کچھ نہ ہوگا اور ہمارا قیمتی مال بچ جائے گا۔ سب نے تجویز قبول کر لی۔ عمیر خان نامی ایک سوداگر سارا وقت دوسروں کے قیمتی مال کو سنبھالنے میں لگا رہا اور اس نے اپنے سامان کی بھی فکر نہ کی۔

پھر عمیر خان نے کہا: ”ہمارے پاس جو کم قیمتی سامان ہے ہمیں اس کی بھی تو حفاظت کرنی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی سواریوں کو بھی تحفظ فراہم کرنا ہے اس کے لیے ہمیں دو دو گھنٹے جاگ کر پہرا دینا ہوگا۔ تم سب سو جاؤ پہلے میں

جاگ کر ڈیوٹی دوں گا۔ دو گھنٹے بعد میں تم میں سے کسی ایک کو جگا دوں گا۔"
سب مطمئن ہو کر سو گئے۔ جب عمیر خان کو یقین ہو گیا کہ سب سو گئے ہیں تو وہ جلدی سے خطرناک موڑ پر پہنچا۔ ڈاکوؤں کے پہرے داروں نے اسے دیکھتے ہی پکڑ لیا۔ اس موقع پر عمیر خان نے ان سے کہا: "مجھے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔ مجھے اُس سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے"
وہ اُسے اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار نے عمیر خان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد کہا: "کہو کیا کہنا ہے۔"
عمیر خان نے کہا "قافلے والوں کا سارا مال غار میں رکھا ہے۔ تم وہاں سے وہ مال لے لو۔ لیکن قافلے والوں کو مت لوٹنا۔ کیوں کہ میرا قیمتی مال وہیں ہے جو مال غار میں رکھا ہے اس میں سے آدھا حصہ میرا ہوگا۔" اس کے بعد ڈاکوؤں نے سارا مال لوٹا اور اطمینان سے واپس چلے گئے۔
صبح ہوئی تو قافلہ پھر روانہ ہوا۔ قافلے کے مسافر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: "دیکھو یہ کتنا نیک انسان ہے اس نے ہماری مدد کی اور اپنے مال کی پروا نہ کی۔ اللہ نے اسے اس بات کا اُجر دیا کہ اس کا مال بچ گیا اور ہمارا مال لٹ گیا۔"
عمیر خان نے کہا: "مجھے آپ کے نقصان کا بہت دُکھ ہوا ہے۔ میں آپ سے علیحدہ سفر کرنا چاہتا ہوں۔"
اس کی بات سن کر سب راضی ہو گئے۔ عمیر خان جلدی سے ڈاکوؤں کے پاس گیا اور اپنا حصہ لے آیا۔ دوسری طرف سوداگر اپنے مقامی دوستوں کو تلاش کر رہے تھے کہ ان سے قرض لے کر اپنا کام دوبارہ شروع کر سکیں۔ وہ بازار میں تھے کہ انھیں عمیر خان نظر آ گیا۔ وہ وہاں اپنا مال بیچ رہا تھا ایک تاجر نے اس کے سامان میں اپنی چیزیں دیکھیں تو چونک گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی کی چیزیں ہیں تو اُس نے چپکے سے سارے سوداگروں کو بتا دیا۔ اُنھوں نے عمیر خان کو پکڑ لیا اور اسے بہت ذلیل کیا اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے عمیر خان سے تمام لین دین ختم کر دیا۔ اب تو عمیر خان بہت پچھتایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسے اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔

☆......☆

غذا

مرسلہ: شاہد حفیظ میلسی

ارشیر بابکان (ایران کا ایک بادشاہ) نے ایک حکیم سے پوچھا: "انسان کو دن بھر میں کتنی غذا کھانی چاہیے؟"
حکیم نے کہا: "ڈیڑھ پاؤ"۔
بادشاہ نے فرمایا: "اتنی سی مقدار بھلا کیا طاقت دے گی؟"
حکیم نے کہا: "جہاں پناہ! انسان کی صحت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ کھاتا ہے وہ غذا کا بوجھ اٹھاتا ہے۔"
(حکایتِ سعدی)
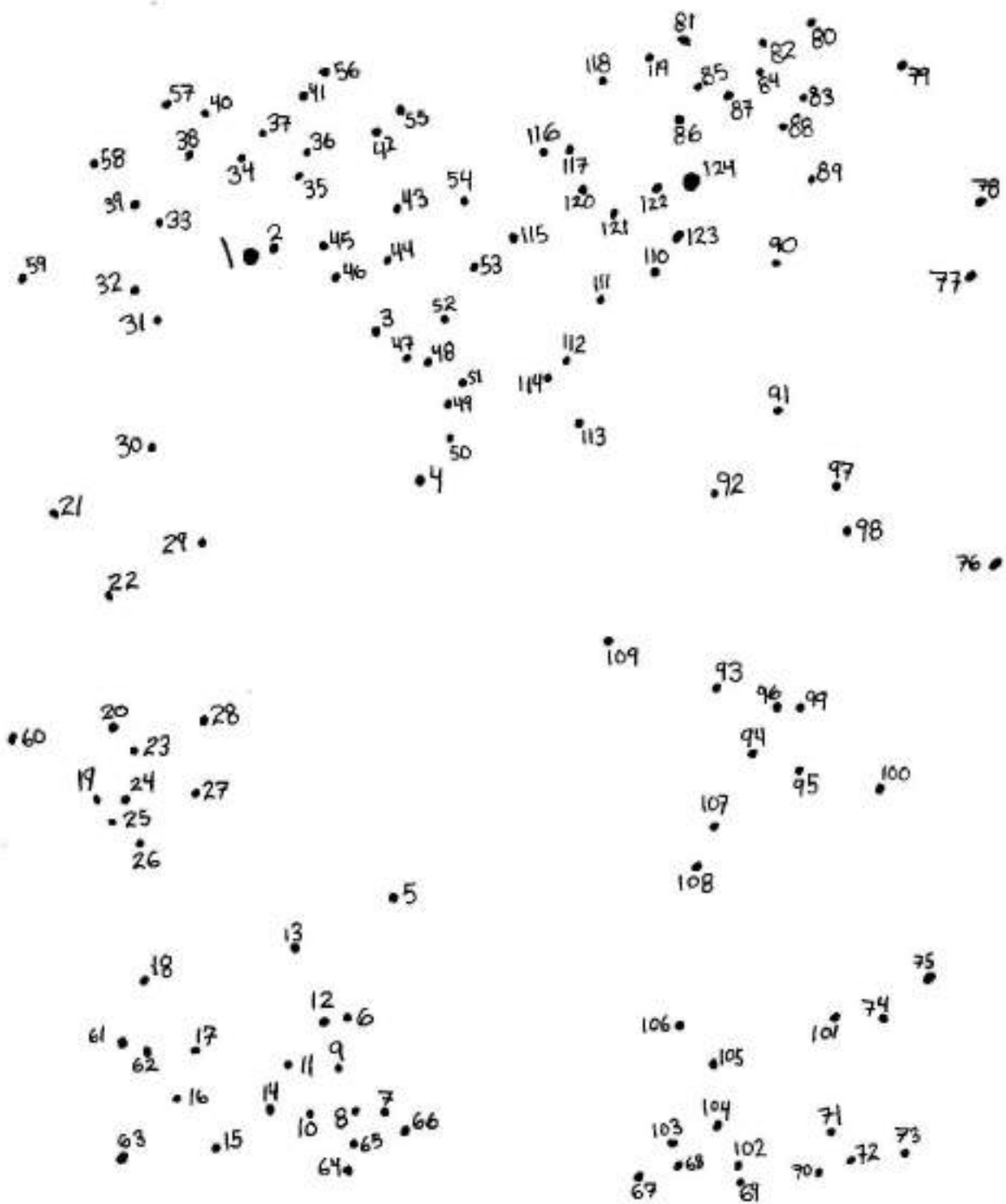
نقطے ملائیں

خط....رے

نامعلوم صاحب بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فروری کا شمارہ کافی دیر سے ملا، سرورق اچھا لگا۔ کہانیوں میں 'فاتح اندلس' (ویسے ہم نے طارق بن زیاد کارٹون قلم بھی دیکھی ہوئی ہے جس میں میری آواز بھی موجود ہے) 'آخری پتا'، 'میں اداس ہوں'، 'خطرناک منصوبہ'، 'جواب مل گیا' اور 'بچت ہوگئی' پسند آئیں۔ نظموں میں 'عباس العزم'، عبدالقادر، صفدر علی صفدر کی نظمیں اچھی تھیں۔ آرٹسٹ کہانی بھی پسند آئی۔ اشتیاق احمد مرحوم پر تینوں مضمون پسند آئے۔ آپ کی تخلیق میں طوبیٰ بنت فاروق اور کومل فاطمہ اللہ بخش کی کہانی پسند آئی اور خطوط میں نائلہ صدیقی اور بنت محسن کا خط پسند آیا۔ غرض پورا شمارہ زبردست تھا اور آخر میں یہ پوچھنا تھا کہ کہانی لکھتے وقت لائن چھوڑیں یا نہیں؟

......لائن ضرور چھوڑیں لیکن خط میں نام لکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

حافظہ رومیہ، اسحاق ساتھی کی ٹیم کو دعائیں دے رہی ہیں

نعیم صدیقی مرحوم کا یہ شعر ساتھی اور اس کی ٹیم کی نذر! میرے ہاتھ میں قلم، میرے ذہن میں اُجالا...... مجھے کیا دبا سکے گا ظلمتوں کا پالا فروری

کا شمارہ خوبصورت، دیدہ زیب اور ناز و انداز لیے موصول ہوا۔ اس کی اشاعت پر میری جانب سے آپ اور آپ کی ٹیم کو بہت بہت مبارکباد ہو۔ پرچے کی ضخامت اور اس کا مواد، اس پرچے پر کی جانے والی محنت کا غماز ہے۔ 'دل پہ دستک' اور 'السلام علیکم' ہمیشہ کی طرح اپنے انداز ایک اہم اور اعلیٰ سبق سمائے ہوئے ہے۔ تحاریر میں 'آخری پتا'، رانا محمد شاہد کی کرکٹ کے حوالے سے تحریر اور اشتیاق احمد مرحوم کے حوالے سے خصوصی گوشہ پسند آیا جبکہ الطاف حسین صاحب کی تحریر تو تمام ہی تحاریر پر بازی لے گئی۔ جب ہمارا خط شائع ہوگا اس وقت ہمارے سالانہ امتحان شروع ہو چکے ہوں گے آپ سب سے دعا کی درخواست ہے۔

......اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

فضل الرحمٰن ایوبی کہتے ہیں

فروری کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سرورق کچھ سادہ سا تھا۔ نظموں میں 'صفدر علی صفدر' کی نظم میں 'مقبوضہ کشمیر ہوں' اچھی تھی۔ اشتیاق احمد مرحوم پر لکھے گئے تمام مضامین پسند آئے۔ اشتیاق احمد بچوں کے نامور ادیب تھے۔ ان کے انتقال سے بچوں کے ادب میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔ خط رے میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

سیدہ منتہیٰ علی ساتھی کا جذباتی انداز میں پوسٹ مارٹم فرما رہی ہیں......

باملاحظہ، ہوشیار، خبردار کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد ہم ایک بار پھر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ سارا مسئلہ یہ ہے کہ کافی ماہ سے آمد نہیں ہو رہی مگر آخرکار آمد کی طرح ڈھیٹ بن کر ہم نے قلم اٹھا ہی لیا تو ہمیں کرنا تھا ساتھی پر تبصرہ اور ہم کرنے لگے خود پر تبصرہ۔ خیر سے ہم زندہ ہیں اور جاوید بھی (اقبال کے چراغ والے ورنہ ہم مونث ہیں) تو جی ساتھی کا سادہ سا پاکستان کی شہ رگ کشمیر کی یاد دلاتا سرورق من کو بھایا اور بہت پسند آیا۔ دل پہ دستک مدیر ساتھی کو سلام کا جواب دیتے ہم پہنچ گئے اُداس بچے تک۔ جس کے ساتھ چلتے چلتے ہمیں اختتام میں جا کر سکتہ ہوگیا۔ اس آخری سطر کو ہم نے کوئی نو دس بار پڑھا اور ہر بار دل پہلے سے زیادہ جذباتی ہوگیا۔ مطلب ہم اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ ہمیں لگ رہا ہے نا جانے کیوں اس بار کا ہمارا تبصرہ خاصا جذباتی ہونے والا ہے شاید اس کی وجہ اس دفعہ کا اُداس اُداس سا ساتھی تھا۔ خیر آخری پتا...... ہائے مجلس ادارت کیا کر رہے ہیں آپ لوگ ور ایسی جذباتی دلدوز قسم کی کہانیاں آگے پیچھے لگا دیں۔ ہم تو بس جذبات کے سمندر میں غرق ہی ہو گئے مگر آخری پتا کا انتہائی خوبصورت پیغام نہایت جذباتی انداز میں ہمارے دل کے آخری کونے تک کو چھو گیا۔ ساتھی سب ہوشیار ہو گئے ساتھ میں جب سے اطہر ہاشمی کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی تو پتا لگا کہ حضرت بہت ہی شائستہ انداز میں آپ کی بات کا پوسٹ مارٹم کر جاتے ہیں اسی لیے ہوشیار رہنا چاہیے خاص کر اُردو کے معاملے میں۔ ہماری کہانیاں نا جانے جاتی کہاں ہیں؟ نا جانے کس جذبے اور کس سوچ کے تحت ہم کوشش جاری رکھیں کو رٹ لیتے ہیں حتیٰ کہ تحریر کے نام کے ساتھ قلمکار کا نام تک جوڑ کر اپنا نام اور تحریر تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'راز کی بات' تو بڑے رازدارانہ انداز میں راز کی بات بتائی جسے ہم نے دل و دماغ دونوں میں بٹھا لیا بس اب قریب آتے امتحانات میں اس پر عمل درآمد کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے (آمین) ہم اور ویگن میں مصنف نے بہت آہیں بھریں مگر ہم صرف ایک ہی جذباتی اور ٹھنڈی آہ بھر سکے کہ ہم کراچی والے اس 'نعمت' عرف زحمت سے محروم ہیں۔ آرٹسٹ وہ کہانی تھی جس میں ہم خاص کر جذباتی ہوئے کہ واللہ اب اس فوٹو شاپ کی ٹیکنالوجی سے مستفید ہو کر ہم کتے کی

ٹیڑھی دم کو بھی سیدھا کر سکتے ہیں (ہیں نا مزے کی بات) 'اور جواب مل گیا' دوسرے لفظوں میں ہم اور جذباتی ہو گئے۔ اس پر بس اتنا ہی کہیں گے کہ جب ہمارا کشمیریوں سے رشتہ لا الہ کا ہے تو ایک نہ ایک دن ہم اس قابل ضرور ہو سکیں گے کہ انھیں اپنا سکیں اور ان کو ان کی آزادی واپس دلا سکیں۔ اشتیاق احمد نے اپنے لافانی کرداروں کے ذریعے ہمیشہ جو بھی دو باتیں سکھانے کی اور سمجھانے کی کوشش کی ہم انھیں ہمیشہ یاد رکھیں اور ان پر عمل کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں جگہ عطا فرمائے (آمین) ہم جذبات کی رو میں بُری طرح بہہ چکے تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی مانند 'بچت ہوگئی' نے ہمیں پار لگایا۔ کہانی نے موڈ کی بچت کروادی اور موڈ خوشگوار ہو گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اکثر گھر کے بوریت والے کاموں میں ان کو دلچسپ بنانے کے لیے ہم ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے جاتے ہیں کہ پھر اماں کا جوتا ہوتا ہے اور ہمارا سر (جذباتی مت ہوں محاورتاً بولا ہے) باقی آپ کی تخلیق میں دن بہ دن ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ 'آہ بیچارے' کے لیے ہم جذباتی ہونے ہی والے تھے ہمیں خیال آیا کہ نا جانے کیوں کتے میاں ہمیں دیکھ کر کبھی جذباتی نہیں ہوئے شاید اس لیے کہ ہمارے ہوتے ہوئے ان کے پاس کیا جذبات رہ گئے؟ اور ہاں ایک بات کب سے ہمیں آپ کے علم میں لانی تھی۔ ساتھی کے کمپوزر بھائی کو 'پچپن' (۵۵) سے کوئی دشمنی ہے جو اسے بچپن بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمارے دو عدد خطوط اور ایک عدد کہانی میں وہ پچپن کو بچپن بنا چکے ہیں۔ بھائی دونوں میں زمین آسمان، انسان حیوان کا فرق ہوتا ہے۔ ذرا خیال کیجیے۔ خطارے میں کول فاطمہ کا خط پڑھتے ہوئے چونک اُٹھے کہ بلال سہیل کی کہانی پڑھتے ہوئے جن احساسات کا شکار ہوئیں حرف بہ حرف ہم نے بھی یہی سب کچھ محسوس کیا تھا۔ مطلب ہمارے جذبات کی چوری (یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے) اب پھر سے ہم اس معاملے پر بہت جذباتی ہونے لگے ہیں تو اس سے پہلے کہ ہمارے خط میں جذبات کے جھکڑ چلیں اور جذبوں کا سیلاب آئے ہم جذباتی انداز میں کنارے لگتے ہیں۔

شرمیلے محمد عمر بن عبدالرشید رقم طراز ہیں

ابو کو مارکیٹ جاتا ہوا دیکھ کر خیال آیا کہ کیا پتا ساتھی خوش بختی سے آ گیا ہو اس لیے کہہ ڈالا کہ ساتھی ضرور لائیے گا اور جب ہمارے حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابو مارکیٹ سے واپس آئے تو رسالہ دیا۔ جو رسالہ پانچ تاریخ تک ملتا ہے وہ اکتیس جنوری کو کیسے مل گیا۔ آخر کیسے...... آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔ جہاں تک بات کی جائے سرورق کی تو وہ کچھ خاص...... یعنی بس اچھا اور گزارے لائق تھا ہاں اندرونی سرورق پسند آیا۔ 'دل پہ دستک' اور 'السلام علیکم' میں ہمیشہ کی طرح ایک سبق پوشیدہ تھا اور پھر جلدی سے خطارے کی طرف بڑھے۔ ہائے محمد عمر اور ساتھی کے چلبلے قاری...... ہمیں تو شرم ہی آ گئی۔ ہمارے چار صفحات کے خط کو پورا دیکھ کر خوشی ہوئی اور اپنے بڑے بھائی کے خط کے ساتھ عمر کا پیچھا کرتے کرتے اسماعیل بھی چلے آئے ہیں۔ پڑھ کر اس کی ایک ہی چیز ڈھونڈی اور ہمیں شک بھی تھا کہ آپ یہی لکھیں گے کیونکہ ہمیں شاہدہ اور زاہدہ یاد ہیں۔ 'میں اُداس ہوں' کا آخری جملہ پڑھا تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ یہ ایک نرالی تحریر تھی۔ 'دلچسپ و عجیب' تو نہ ہی دلچسپ تھے اور نہ ہی عجیب۔ 'فاتح اندلس' معلوماتی تحریر تھی۔ 'تاج المساجد' نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ 'آخری چال' کہنے کے لیے الفاظ نہیں۔ بہترین تحریر تھی اور مسٹر بریمن اور گل رعنا کو داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ 'اردو زباں ہماری' اطہر ہاشمی صاحب بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ 'حشرات الارض کا خطرناک جانور' معلوماتی تحریر تھی لیکن جب وہ حشرات ہے تو جانور پھر کیوں لکھا ہے؟ 'ذرا کھلکھلائیے' نے خوب ہنسایا۔ ہمارے لطائف بھی کبھی شائع کر لیا کریں۔ 'راز کی بات' زبردست کہانی تھی۔ حماد ظہیر کی کہانی 'آرٹسٹ' کا ہم اختتام اخذ کر چکے تھے۔ ہم اور ویگن، اُف ہمیں تو کچھ پل کے لیے ایسا لگا کہ ہم اس ویگن میں بیٹھے ہیں۔ ساتھی مصوریاں پسند آئیں۔ 'یہ بھی دنیا ہے' ارے بھئی ہم نے

کب کہا کہ یہ چاند ہے۔ 'خطرناک منصوبہ' اتنا بھی خطرناک نہ تھا لیکن کہانی پسند آئی۔ 'گوشہ اشتیاق احمد' پڑھ کر دکھ ہوا۔ 'اور جواب مل گیا' معصوم سی تحریر تھی۔ 'بچت ہوگئی' میں پھوپھا پر غصہ آیا کہ یہ کیسے پھوپھا ہے...... مغرور کہیں کے، کہانی دلچسپ تھی۔ خطارے میں اس بار بڑے بڑے خطوط تھے۔ تمام خطوط پسند آئے۔ نائلہ صدیقی کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ 'آپ کی تخلیق' میں 'فرق تو ہے' اور 'باغ کا مالی' (نظم) پہلے نمبر پر رہی جبکہ 'آہ بیچارے'، 'مگر مچھ'، 'صبح کی سیر' اور 'ہمارا آئیڈیا' بھی پسند آئی۔ اور ہاں خطارے میں سید محمد شارق ابرار شجر کا خط عجیب سا تھا۔

بچوں کی ادیبہ فرزانہ روحی اسلم کو اپنی بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں

خدا کرے خیریت سے ہوں۔ ایک بات یاد آ گئی ہے کہ ورک شاپ میں آئندہ ترجمے کے فن پر بھی کسی کو اظہار خیال کے لیے مدعو کیجیے گا۔ ادب وصحافت میں تراجم کے اہمیت سے آج کے دور میں انکار ممکن نہیں ہے۔ ساتھی میگزین اور اس کے تحت ہونے والے اکثر پروگرامز میں میں خاموشی سے شریک ہوتی ہوں۔ (خاموشی کا مطلب بغیر کسی کو بتائے) مجھے آپ کے سارے پروگرام پسند آئے۔ خدا کرے کہ آپ لوگ اسی طرح کامیاب وکامران رہیں۔ (آمین)

سمیرا امیر اُداس ہیں

دو ماہ کی غیر حاضری کا سبب میری عزیز از جان بھتیجی کی وفات تھی جس کے غم نے مجھے قلم کاغذ سے دور کر دیا تھا۔ فروری کا سرورق وادی کشمیر کی غم ناکی بیان کر رہا تھا۔ دل پہ دستک اور السلام علیکم نے اچھے اسباق دیے۔ 'میں اُداس ہوں' اچھی تحریر تھی جبکہ 'فاتح اندلس' اور 'آخری چا' بھی دلچسپ لگیں۔ 'خطرناک منصوبہ' واقعی خطرناک تھا۔ باقی تمام کہانیاں بھی اپنی جگہ بہترین تھیں جبکہ 'آپ کی تخلیق' ہمیشہ کی طرح اچھی کہانیوں سے پُر تھیں۔ 'خطارے' کافی دن پہلے پڑھے تھے سو یاد نہیں کہ کس کا خط اچھا تھا اور دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہیں۔ سالنامے پر نائلہ صدیقی کا دلچسپ تبصرہ واقعی دلچسپ تھا بالکل ان کی طرح۔ وقت کی کمی کے باعث ہم کسی سے بھی ٹھیک طرح مل نہ پائے سو ایک خلا سا دل میں باقی ہے۔ جو کہ ہم گائیڈنس فورم میں بھی پُر نہ کر سکے کیونکہ ابھی دونوں بھتیجی فوت ہوئی تھیں تو آنا ناممکن تھا۔

......اللہ آپ کی بھتیجی کو جنت الفردوس میں عطا فرمائے اور آپ کے بھائی بھابھی کو صبر جمیل دے۔ (آمین)

رافعہ فاروق کا خط ہمارے ہاتھ لگا ہے

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے قلم (اور اپنی عقل) کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اُمید ہے آپ اسے رائیگاں نہ کریں گے اور ردی کی ٹوکری سے محفوظ رکھیں گے۔ فروری کا شمارہ پڑھنے کے بعد ہم نے سوچا کہ تبصرہ کر کے آپ کو آگاہ بھی کر دیتے ہیں اس دفعہ کا شمارہ کچھ خاص نہ لگا۔ سرورق اتنا جاندار تھا مگر جب دل پہ دستک پڑھا تو واقعی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ تقدیر پر شکوہ کرنے سے تقدیر اچھی نہ ہوگی بلکہ اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکامات پر کاربند ہونے سے ہی آپ اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ اشتیاق احمد کے انتقال کے بعد جاسوسی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے ان کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین) کہانیوں میں 'میں اُداس ہوں' پڑھ کر دل اُداس ہو گیا۔ گل رعنا کی کہانی "آخری چا" کا مرکزی خیال اس سے پہلے کسی اور رسالے میں نظروں سے گزرا ہے۔ حماد ظہیر کی 'آرٹسٹ' اسی معاشرے کے کچھ لوگوں کا احاطہ کرتی ہے۔ 'بچت ہوگئی' پڑھ کر مزہ آیا۔ اس کے علاوہ ہمیں کوئی کہانی اچھی نہ لگی۔ نظمیں سب ٹھیک ہی تھیں۔ دو تین لطائف آپ نے صفحات کے درمیان میں بھی دوبارہ دے دیے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے ہمیں مواد کچھ کم لگا۔

......کشمیر کے حوالے سے کافی چیزیں موجود تھیں۔ اگر ساری تحریریں کشمیر سے متعلق کر دی جائیں تو وہ کشمیر نمبر ہو جاتا۔

آمنہ خاندان بھی حسب معمول ہمارے درمیان موجود ہیں

فروری کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ شعر بھی خوب صورت بس پھر تو ہم جھوم اُٹھے۔ دل پہ دستک نے ہمیں جھنجھوڑ دیا۔ یہ صفحہ ہمیں بھی پسند ہے۔ 'میں اُداس ہوں' نے ہمیں بھی اُداس کر دیا۔ فاتح اندلس معلوماتی اور دل پہ اثر کرنے والی کہانی تھی۔ نظم 'مایوس نہ ہوں' اچھی تھی۔ 'آخری پتا' اچھی لگی۔ ذرا مُسکرائیے میں ٹھیک تھا۔ 'راز کی بات' زبردست پیغام تھا۔ آرٹسٹ زبردست تحریر تھی۔ یہ بھی دنیا ہے اچھا لگا۔ گوشۂ اشتیاق بہت اچھا لگا۔ لیکن دل کو تسکین نہیں ہوتی دل چاہتا ہے کہ ان کے بارے میں اور پڑھے۔ ان کی کوئی ناول شروع کر دیں۔ خطرناک منصوبہ زبردست کہانی تھی۔ ساتھ ہی خوصورت پیغام بھی دے رہا ہے۔ 'اور جواب مل گیا' بھی اچھی تھی۔ اور آزادی کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔

محمد شیراز انصاری لکھتے ہیں

فروری کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ ساتھی تو ۲۰۱۴ء سے پڑھ رہا ہوں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح شمارہ لاجواب تھا۔ 'آرٹسٹ' حماد ظہیر کی لاجواب تحریر تھی۔ اشتیاق احمد میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے (آمین) بچت ہو گئی ایک دلچسپ کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ عبدالقادر عارف کی نعت خدا کے بعد مجھے بہت زیادہ پسند آئی۔ 'راز کی بات' میں جاوید بسام محنت کا سبق سکھا رہے تھے۔ تاریخ کی کھوج' اچھا سلسلہ ہے لیکن ہمارے کچھ پلے نہیں پڑتا۔ 'اردو زباں ہماری' سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ 'ذرا مُسکرائیے' ہم پڑھتے تو ہیں لیکن کبھی لطیفے بھیجے نہیں۔ ہم سنجیدہ مزاج ہیں۔ (خوش فہمی)

......آپ کو ساتھی کے خطارے میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

حلیمہ اپنا تعارف خود کروا رہی ہیں

میرا نام حلیمہ ہے میں ہلال پبلک اسکول سیکنڈری اسکول کی کلاس ششم میں پڑھتی ہوں۔ مجھے ساتھی رسالہ بہت پسند ہے اور فروری کے ساتھی رسالہ میں 'میں اُداس ہوں' بہت اچھی کہانی تھی جو مصطفیٰ سونگی نے لکھی ہے اور 'آخری پتا' بھی پسند آئی۔ کیش رانا کا لطیفہ پسند آیا۔ جاوید بسام کی کہانی 'راز کی بات' بہت ہی اچھی تھی۔ 'دلکش پرندے' کی نظم بہت پسند آئی۔ ساتھی مصوری میں کومل فاطمہ اللہ بخش، فلیزہ نذیر اور محمد عمر بن عبدالرشید کی تصویریں عمدہ تھیں۔

ششم کلاس کی طالبہ سنبل لکھتی ہیں

مجھے فروری کا رسالہ بہت پسند آیا۔ جاوید بسام کی 'راز کی بات' بہت زبردست تھی۔ سیدہ عروج معراج کی تحریر کچھ سمجھ میں نہیں آئی اور سر کے اوپر سے گزر گئی۔ 'آپ کی تخلیق' میں صبح کی سیر اچھی لگی۔ 'باغ کا مالی' اچھی نظم تھی۔

سیدہ سائرہ سکندر اپنی شکایات کے ساتھ حاضر ہیں

ساتھی کا انتظار تو ہر مہینے شدت سے ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ انتظار اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ بس کیا بتائیں اور پھر جیسے ساتھی کا نیا شمارہ ہمارے گھر داخل ہوتا ہے تو میں اس پر ایسے جھپٹتی ہوں جیسے گوشت پر بلی۔ سچ میں جب تک پورا رسالہ نہ پڑھ لوں سکون ہی نہیں ملتا اور پھر میں تبصرہ نہ کروں تو یہ تو غلط بات ہے اور اگر میرا خط شائع نہ ہو تو یہ اس سے بھی بُری بات ہے ناں! فروری کے شمارے میں کشمیر کے حوالے سے بھی کافی مضامین شامل تھے۔ اشتیاق احمد کی وفات ہم سب کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ نظم 'خدا کے بعد' بہت ہی اعلا نظم تھی۔ 'آخری پتا' اور 'میں

اداس ہوں' بھی خوب تھیں۔ 'راز کی بات' بہت ہی بہترین کہانی تھی۔ جس میں جاوید بسام نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ محنت کی عظمت کا درس دیا ہے۔ 'غبارے' کے دو یا تین صفحات بڑھا دیں۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ آپ لوگ مشکل الفاظ کے معنی کیوں نہیں دیتے۔ آپ نے نظم میں مقبوضہ کشمیر ہوں کہ آخر میں تو معنی دیے ہیں حالانکہ میرے خیال سے اس نظم میں کوئی خاص مشکل الفاظ نہیں ہیں جبکہ مایوس نہ ہو میں کافی مشکل الفاظ ملے۔ برائے کرم ان الفاظ کے معنی بتا دیجیے۔ تیقن، کمخواب وزری، نغمہ بار۔

▶ ......تیقن......یقین ہونا، کمخواب وزری......سونے چاندی کے دھاگوں سے بنا ہوا کپڑا، نغمہ بار......نغمہ برساتے ہوئے، گیت الاپتے ہوئے، مراد: خوش وخرم، شادماں

کومل فاطمہ اللہ بخش مناسب جملوں کا استعمال کرتے ہوئے کہتی ہیں......

فروری کے ساتھی کا سرورق کئی پیغام دے رہا تھا۔ زرد پتوں سے خزاں کی آمد کی خبر مل رہی تھی اور طلوع ہوتا سورج اس بات کا ضامن تھا کہ اندھیرے ختم ہو ہی جاتے ہیں اور اک سطر تحریر تھی جو روشنی کو پھر سے جلانے کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اس بار دل پہ دستک میں محترم شاعر مشرق کے شعر کو جس طرز سے بیان کیا گیا وہ قابل تعریف اور ہر کسی کی سمجھ میں آنے والے الفاظ تھے۔ نہایت ہی شاندار۔ ساتھی چٹخارے کے صفحے کھولے، دوسرے صفحے پر اپنا نام دیکھا۔ خوشی تو ہوئی مگر اچانک کی حیرت بھی ہوئی۔ غلام مصطفیٰ سولنگی کی کاوش میں اُداس ہوں بہت گہرے معنی سمجھا رہی تھی۔ فاتح اندلس (سید سمیر احمد) تاریخی اور بہت اچھے انداز سے بتایا گیا۔ ماموں کے 'راز کی بات' جاوید بسام نے بتائی وہ تو بہت ہی راز داری کی بات تھی جو شاید ہر کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ فردوس عالم نے جو ویگن میں سیر کا احوال بتایا اسے پڑھ کر ہم کو بھی ویگن میں کسی اور کو سیر کروانے کا شوق آن چڑھا۔ پھر ان سے ویگن کے حالات معلوم کر کے اسے ایک تحریر بنا کر ہم بھی شائع کروانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔
ہمیں سب سے اچھی دو تحریریں لگیں ایک تو آرٹسٹ جو حماد ظہیر کی کاوش ہے اچھی تو ہونی ہی تھی۔ کیا کمال کے آرٹسٹ سے انہوں نے ہمارا تعارف کروا دیا۔ بہت اعلیٰ اور دوسری تحریر جو دل کو بھائی وہ تھی گل رعنا کی ترجمہ کردہ آخری پتا کی کہانی۔ اس میں بوڑھے مصور نے اپنا جو خواب پورا کیا وہ بہت اعلیٰ ظرفی کا کام تھا۔ محترم اشتیاق احمد مرحوم کے حوالے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی کبھی بھر پائے۔ مگر ہم ان کے ناولوں کا مرکزی خیال تو اپنا کر تھوڑا کچھ تو کر ہی سکتے ہیں جن کی انہیں تمنا تھی۔ آپ کی تخلیق میں طوبیٰ بنت فاروق نے بیچارے کتوں پر کافی تحقیقات کر کے جو آہ بیچارے نامی تحریر لکھی وہ بہت اچھی لگی۔ صبح کی سیر (شاہ میر احمد چودھری) بھی اچھی تھی۔ آمنہ احمد بنت سفیر نے ایک آئیڈیا پیش کیا میں اس کو سراہتی ہوں مگر اک بات کہنا چاہوں گی کہ آئیڈیا یا جو بھی خیال ہو تب تک اچھا نہیں جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے۔ 'یہ بھی دنیا ہے'، 'بلبلے بنائیں' اور 'حشرات الارض کا خطرناک جانور' بہت معلوماتی سلسلے ثابت ہوئے۔ تاج المساجد اور دلچسپ وعجیب بھی اچھے رہے۔ ساتھی مصوری میں فلیزہ وندیر کی مصوری بہت اچھی لگی۔

ہلال پبلک اسکول کی کومل بھی ہمارے درمیان موجود ہیں

غلام مصطفیٰ سولنگی کی کہانی 'میں اداس ہوں' شاندار کہانی تھی۔ فاتح اندلس سید سمیر احمد نے ہمارے عزم کو مزید قوی بنایا۔ 'آخری پتا' گل رعنا بڑی زبردست کہانی ہے۔ لطیفوں میں مجھے فاطمہ احمد، کومل فاطمہ اللہ بخش، بکیش رانا اور جویریہ بنت عبدالرحمٰن کے لطیفے پسند آئے۔ 'ہم اور ویگن' (فردوس عالم) میں ویگن کا خوب نقشہ کھینچا۔ حقیقت میں آج کل بسوں کا یہی حال ہے۔ بس ہو یا ویگن وہاں سر کے بال پرندوں کا گھونسلہ بن جاتا ہے اور جو سامان لے کر چڑھے ہوتے ہیں وہ سب کچھ بھیڑ بھاڑ میں گم ہو جاتا ہے۔

آوازِ معلم کے مصنف میرے والد

عباس العزم

قراۃ العین تعریفہ

میرا نام قرۃ العین تعریفہ ہے اور میری شخصیت بلاشبہ تعارف کی محتاج ہے اور میرا تعارف میرے لیے باعث فخر ہے کیونکہ میں بیٹی ہوں محمد عباس صاحب کی جو کہ ادبی دنیا خاص طور پر بچوں کے ادب میں عباس العزم کے نام سے ایک جانی مانی شخصیت ہیں۔ میں نے اس طرح سے کچھ لکھنے کے لیے کبھی قلم نہیں اُٹھایا کیونکہ میں ایک عام سی گھریلو خاتون ہوں لیکن دو وجوہ ایسی ہیں جنھوں نے مجھے کچھ لکھنے کا حوصلہ دیا اور میرا دل چاہا کہ میں ان کے بارے میں ضرور کچھ کہوں۔

ان میں ایک بڑی وجہ میرے والد صاحب جناب عباس العزم ہیں۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی کہوں وہ کم ہے، اتنا ضرور کہنا چاہوں گی کہ میرے والد ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جن کی نگاہ زندگی کے ہر پہلو پر رہتی تھی۔

انھوں نے اپنی زندگی ایک مقصد کے تحت گزاری اور وہ تھا 'علم'۔ علم کی اتنی قدر کرتے میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ علم حاصل کرنا اور اس کو بہتر طریقے سے دوسروں تک پہنچانا ان کا مقصد رہا۔ اب چاہے وہ قرآن پاک جیسی عظیم کتاب ہو یا سائنس کے بارے میں کوئی تحقیق یا الفاظ کی بنیاد کی تلاش وہ ان سب کے بارے جستجو میں لگے رہتے تھے۔

بچوں کی نظمیں لکھتے، جن میں بہت ہی پیارے انداز میں بچوں کو کوئی نہ کوئی نصیحت کر جاتے تھے۔ بچوں کی

نظموں پر مشتمل ان کی کتابیں جن میں 'سنگ سنگ ہم چلیں'، 'پھول اور تتلیاں'، 'پیار کی خوشبو' ان پر ان کو ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کی 'آوازِ معلم' تو ایک بہترین کتاب ہے جس میں بہت سادہ اور عام فہم الفاظ میں اُنھوں نے زندگی کے ہر پہلو پر طالب علموں کو بہترین راہ دکھائی ہے۔ میرے والد صاحب نے اپنی زندگی جن اُصولوں کے تحت گزاری اُن میں دیانتداری، وقت کی پابندی، سچائی اور علم کا حصول تو سرفہرست ہیں۔ میرے والد صاحب کے والدین ان کے بچپن میں ہی گزر گئے تھے، اُنھوں نے زندگی میں یہ مقام بہت محنت اور لگن سے حاصل کیا۔ اُنھوں نے اعلا تعلیم حاصل کی۔ اُنھوں نے ڈبل ایم اے، ایم ایڈ کیا اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور پرنسپل مقرر ہوئے اور ۵ فروری ۲۰۰۰ء کو پرنسپل (گریڈ ۲۰) میں ریٹائر ہوئے۔ وہ اسلام آباد میں ڈسٹرکٹ کمشنر کے اعزازی عہدے پر بھی فائز رہے۔

دورانِ ملازمت وہ ایک شفیق اُستاد، باصلاحیت مدرس اور کامیاب منتظم سمجھے اور مانے جاتے تھے۔ ان کے دوست احباب آج بھی ان کو بہت اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں، ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی بیٹی ہونے کے ناتے مجھے ان پر بے انتہا فخر ہے۔ ان کی کمی تو اب زندگی بھر رہے گی لیکن ان کی کہی باتیں ان کی نصیحتیں قدم قدم پر میرے اور میرے بچوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ اللہ میرے والد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے (آمین)۔

دوسری وجہ جس نے لکھنے پر مجبور کیا وہ بچوں کا 'کل پاکستان مشاعرہ' اور 'ساتھی رائٹرز ایوارڈ ۲۰۱۵ء' کی بہترین تقریب تھی۔ اس تقریب میں شرکت کر کے جہاں خوشی ہوئی وہاں ہی بہت تھوڑے وقت میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ بہت ہی منظم، مہذب اور دلچسپ تقریب تھی۔ شعرا کے کلام اور تقریب کے شرکا کی گفتگو سے ہم کافی لطف اندوز بھی ہوئے۔ مجھے اس تقریب میں آ کر اپنے والد صاحب کی بہت کمی محسوس ہوئی اور محسوس ہوا کہ واقعی میرے والد صاحب ان سب کا ہی ایک حصہ تھے کیونکہ جو باتیں جو تمیز جو تہذیب وہاں موجود بزرگ بتا رہے تھے وہ میرے والد صاحب بھی ہمیں بتاتے اور سمجھاتے تھے۔ تقریب میں موجود شرکا کا کمال یہ تھا کہ ان کے انداز اور الفاظ میں ایسا اثر تھا کہ سننے والے کو زندگی بھر یاد رہے۔ جتنی ملائمت اور محبت سے وہ بچوں سے بات کر رہے تھے اور بچے جس طرح سے ان کی باتیں سن رہے تھے، وہ سب بہترین تھا۔

ساتھی ادارے کے تمام لوگ جو اس ادارے سے منسلک ہیں وہ بہت زیادہ تعریف کے مستحق اور قابلِ احترام ہیں۔ ان سب کی کوششوں اور محنت کو سلام ہے۔ ماہنامہ ساتھی بہترین ہے۔ میرے والد صاحب ہمیشہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کی تعریف کرتے تھے اور بالکل صحیح کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ماہنامہ ساتھی کو بے انتہا کامیابیوں سے ہمکنار کرے (آمین)۔

☆......☆